وحدت و اجتماعیت
اور
ہماری تحریکی زندگی

ڈاکٹر حسن محی الدّین قادری

وحدت و اجتماعیت
اور
ہماری تحریکی زندگی

وحدت واجتماعیت

اور

ہماری تحریکی زندگی

ڈاکٹر حسن محیؒ الدین قادری

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

تصنیف: ڈاکٹر حسن محیُ الدّین قادری

معاونت : جلیل اَحمد ہاشمی، سبط جمال پٹیالوی

زیرِ اِہتمام : فریدِ ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ - Research.com.pk

مطبع : منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعت نمبر 1 : جون 2017ء [1,100 - پاکستان]

قیمت :

twitter.com/DrHassanQadri

facebook.com/DrHassanQadri

بسم الله الرحمن الرحيم

مولاي صل وسلم دائما أبدا
على حبيبك خير الخلق كلهم

محمد سيد الكونين والثقلين
والفريقين من عرب ومن عجم

اللهم صل على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وبارك وسلم

فہرس

پیش لفظ 11

باب نمبر 1

فلسفۂ وحدت و اِجتماعیت اور تحریکی زندگی 15

﴿تخلیقِ کائنات و اِنسان کے تناظر میں﴾

۱۔ فلسفہ وحدت و اِجتماعیت سے مراد 17

۲۔ فلسفہ وحدت و اِجتماعیت اور تخلیقِ کائنات 19

۳۔ فلسفہ وحدت و اجتماعیت اور تخلیقِ انسانی کا بیان 24

وحدت نکرہ کی اور اجتماعیت معرفہ کی مظہر ہے 27

۴۔ وحدت و اجتماعیت اور قلبِ انسانی 31

۵۔ وحدتِ نورِ مصطفیٰ ﷺ 35

۶۔ میثاقِ اَنبیاء اور فلسفہ وحدت و اِجتماعیت 38

۷۔ واقعہ معراج اور وحدتِ شانِ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ 39

۸۔ قبر میں وحدتِ حسنِ مصطفیٰ ﷺ کی پہچان کا سوال 42

۹۔ انقلابی تحریکی زندگی اور فلسفہ وحدت و اجتماعیت 44
۱۰۔ فنائیتِ ذات کا بیان: قرآن حکیم کی روشنی میں 49

باب نمبر 2

تحریکی زندگی میں نظم و ضبط 53

﴿ایک قرآنی تمثیل﴾

۱۔ شہد کی مکھی اور انسان میں بنیادی فرق 56
۲۔ شہد کی مکھی کا منہجِ حیات 56
۳۔ شہد کی مکھی کی منزلِ یقین اور فرض شناسی 58
۴۔ محبت و وحدت اور اِجتماعیت کا ثمر 59
۵۔ تنظیم سازی کا ایک نادِر نمونہ 60
۶۔ طہارت و پاکیزگی 60
۷۔ شفاء و منفعت 61
۸۔ دیانت و وفاداری 61
۹۔ بے مثال محنت و مشقت 62
۱۰۔ انسان اور شہد کی مکھی کا منہجِ حیات 62

١١۔شہد کی مکھی بحیثیت ایک عظیم کارکن 63

١٢۔منہاج القرآن کا کارکن اور قائد سے تعلق 64

١٣۔شکرانِ نعمت پر جزا اور کفرانِ نعمت پر سزا کا اُلوہی ضابطہ 66

١٤۔مقام تلوین اور مقام تمکین 71

باب نمبر 3

قائد اور اُس کے اَوصاف 73

﴿واقعہ ذوالقرنین کی روشنی میں﴾

١۔ زمین میں اِقتدار کا بخشا جانا 76

٢۔ وسائل و اَسباب کا عطا کیا جانا اور لوگوں کی خبر گیری رکھنا 77

٣۔حضرت ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی مہمات کا بیان 78

٤۔مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور ضرورتِ ذوالقرنین 78

٥۔ ظالم قوم کی طرف پہلا سفر 80

٦۔حق کا معیار اور قائدانہ صلاحیت 81

٧۔ بے بس قوم کی طرف سفر 83

٨۔ بے شعور قوم کی طرف تیسرا سفر 85

۹۔ ذوالقرنین کی انتظامی استعداد 90

۱۰۔ واقعہ ذوالقرنین کی روشنی میں دیگر اَوصافِ قیادت 91

باب نمبر 4

نظامِ تربیت اور تصورِ جواب دہی 95

﴿واقعہ ہُد ہُد کی روشنی میں﴾

واقعہ سلیمان علیہ السلام کے اہم نکات 97

۱۔ مشاہدہ 98

۲۔ ترغیب و ترہیب 99

۳۔ امورِ نگہبانی 100

۴۔ نقطہ نظر کی درستگی (Positivity in approach) 101

۵۔ کسی کام کا سپرد کرنا (Assignment) 101

۶۔ جامع علم (Comprehensive knowledge) 102

۷۔ قیادت کی وسیع القلبی اور مشاورت 104

۸۔ قائدانہ صلاحیت 105

مصادر و مراجع 109

پیش لفظ

یہ دور ملتِ اسلامیہ کے لیے زوال و انحطاط کا دور ہے۔ دورِ زوال کی ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے مقام سے گرنا شروع ہوتی ہے تو پھر مکمل زوال تک اس کی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ زوال جب اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو پھر عروج کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس قدیم شکستہ عمارت کی سی ہوجاتی ہے کہ اس کی جگہ نئی عمارت اس وقت تک تعمیر نہیں کی جاسکتی جب تک کہ پہلی دیمک زدہ شکستہ بنیادوں کو ختم کر کے جڑ سے اکھاڑا نہ جائے۔

عالمی سطح پر مختلف اسلامی تحریکیں عالم گیر غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں مصروفِ عمل ہیں۔ کسی بھی انقلابی تحریک سے مراد زوال پذیر معاشرے میں اجتماعی سطح پر اعلیٰ قدروں کے احیاء و تجدید کے لئے کی جانے والی وہ عظیم اور مثالی جد و جہد ہے جو ایک طرف اعلیٰ قدروں کے فروغ و نفوذ کا باعث بنتی ہے جب کہ دوسری جانب یہ ان عناصر کی بیخ کنی بھی کرتی ہے جو حق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ سارا عمل اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک قوم کی مؤثر افرادی قوت شعوری اور عملی طور پر اس امر کی انجام دہی کے لیے تیار نہ ہوجائے۔ جب ایک مقصد کے حصول کے لیے وابستگان متحرک ہوکر اپنی منزل کے حصول کے لئے جد و جہد میں ہمہ تن ہوکر مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ مشن ایک تحریک کی شکل اختیار کر کے چار دانگ عالم میں اپنی اہمیت دکھاتا ہے۔

اِنقلابی تحریک ایک واضح نصب العین کا نام ہے جو اپنے وابستگان سے مثالی سیرت و کردار کا تقاضا کرتی ہے۔قول وفعل اور نظریہ کی ہم آہنگی کے بغیر کسی تحریک کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ۔تحریک کا دوسرا نام ہر لمحے مقصد کے حصول کے لئے بے قرار رہنا ہے۔ یہ صرف موہوم

امیدوں اور جذباتی نعروں کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک دائمی اور مسلسل عمل ہے جو زمینی حقائق کے تحت زیر و بم کے ساتھ بلا اِنقطاع جاری رہتا ہے۔ یہ ایسا جان گسل سفر ہے جس میں روانی زندگی ہے اور ٹھہراؤ موت۔ انقلابی تحریک کا دیگر سیاسی تنظیموں اور جماعتوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے تقاضے روایتی سیاست جیسے نہیں بلکہ آفاقی طرز کے ہوتے ہیں۔ منظّم اور تربیت یافتہ، انقلابی فکر کے حامل کارکن اس کا ہراول دستہ ہوتے ہیں جو اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں حصولِ مقصد کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اگرچہ ہر کام کا انجام اور ہر عظیم فریضہ کی توفیق اللہ مالکِ کل نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے مگر یاد رہے کہ اللہ رب العزت نے کامیابی کو جد و جہد سے مشروط رکھا ہے۔ اس روزِ روشن کی طرح عیاں حقیقت کے تحت تحریک عزم و ہمت اور یقین کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر آگے بڑھتی ہے۔

اللہ رب العزت نے سورہ آل عمران کی آیت نمبر 144 میں مسلسل جد و جہد کرنے اور نا اُمید نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ○

اور محمد (ﷺ بھی تو) رسول ہی ہیں (نہ کہ خدا)، آپ سے پہلے بھی کئی پیغمبر (مصائب اور تکلیفیں جھیلتے ہوئے اس دنیا سے) گزر چکے ہیں، پھر اگر آپ (ﷺ) وفات فرما جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنے (پچھلے مذہب کی طرف) الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی کیا ان کی وفات یا شہادت کو معاذ اللہ دین اسلام کے حق نہ ہونے پر یا ان کے سچے رسول نہ ہونے پر محمول کرو گے)، اور جو کوئی اپنے الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ عنقریب (مصائب پر ثابت قدم رہ کر) شکر کرنے والوں کو جزا عطا فرمائے گا○

جوں جوں انقلابی تحریک حصولِ مقصد کی طرف بڑھتی ہے توں توں نئے نئے سوالات اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن تحریک کے داعی حق کے معاملے میں کسی نکتہ چیں کی کڑوی کسیلی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اس ضمن میں تحریک کے قائدین کی ذمہ داری ہے کہ ایسے ہر سوال اور شک و شبہ کا بر وقت ازالہ کیا جائے تا کہ کارکنوں پر بے یقینی کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔ اسی طرح مشن کی ترویج اور تحریکی امور کے فروغ کے لیے جدید ذرائع یعنی انٹرنیٹ، الیکٹرانک میڈیا اور تحریر و تصنیف کی اہمیت اور افادیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تحریکِ منہاج القرآن احیاء اسلام کی عالم گیر تحریکوں میں سے ایک مؤثر مصطفوی انقلاب کی داعی آفاقی تحریک ہے۔ ہر تحریک کا ایک خاص طریقہ کار اور مزاج ہوتا ہے۔ تحریک منہاج القرآن کا لائحہ عمل - جیسا کہ نام سے واضح ہے - قرآن حکیم کے منہاج سے تعبیر ہے۔ اگر ہم قرآنی نقطۂ نظر سے اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن ہی سے رجوع کرنا چاہیے کہ اُم الکتاب نے کسی بھی تحریک کی کامیابی کا انحصار کن بنیادوں پر استوار رکھا ہے۔

اس تصنیف کا مقصد فلسفۂ وحدت و اجتماعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصطفوی کارکنوں کی قرآنی اصولوں پر تربیت ہے۔ اس کے پہلے باب میں فلسفۂ وحدت و اجتماعیت کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں کارکنوں کو قرآنی تمثیل کے ذریعے شہد کی مکھی کی سخت کوشی، پاکیزہ اوصاف، دیانت داری، وفا داری اور اپنے مشن کی تکمیل کو ہر شے پر مقدم رکھنے کے اوصاف اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ تیسرے باب میں حضرت ذو القرنین کے قرآنی واقعہ کی روشنی میں عظیم انقلابی قائد کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دلائل کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ دورِ حاضر کا ذوالقرنین کون ہے؟ چوتھے باب میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد والے واقعہ کے تناظر میں قیادت کی وسیع القلبی، ترغیب اور امورِ نگہبانی کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف دراصل مصطفوی انقلاب کی تحریک کے کارکنوں کے لیے قرآنی انوار سے منور ایک ہدایت نامہ ہے۔ قابلِ ذکر بات ہے کہ فلسفہ کے تناظر میں لکھی گئی ایک تصنیف ہے، مگر سلاست، روانی اور دل چسپ اندازِ تحریر نے اسے آسان اور زود فہم بنا دیا ہے۔ اللہ رب

العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تحریکی حوالے سے اپنے حقوق و فرائض پوری تن دہی سے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ)

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری

یکم رمضان ۱۴۳۸ھ

باب نمبر 1

فلسفۂ وحدت و اِجتماعیت اور تحریکی زندگی

﴿تخلیقِ کائنات و اِنسان کے تناظر میں﴾

وحدت کیا ہے اور اجتماعیت کیا ہے؟ ان دونوں کا آپس میں کیا ربط ہے؟ ان کے پیچھے کیا حکمت اور فلسفہ کارفرما ہے؟ ہماری تحریکی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس باب کا محور و مرکز انہی سوالات اور ان کے تسلی بخش جوابات پر ہے۔

۱۔ فلسفہ وحدت و اِجتماعیت سے مراد

ہر اجتماعیت کی ابتدا جس طرح وحدت سے ہوتی ہے۔ عین اسی طرح ہر اجتماعیت کی انتہا بھی وحدت پر ہی ہوتی ہے۔ وحدت میں اسرار و رموز کو نہاں رکھا جاتا ہے اور اجتماعیت میں اُس راز کو عیاں کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے اہل اللہ کہتے ہیں کہ وحدت خواص کے لیے ہوتی ہے اور اجتماعیت عامۃ الناس کے لیے ہوتی ہے۔ جس کی وحدت حق پر پہنچ گئی تو اس کی اجتماعیت وحدت کی وجہ سے خود ہی سنور جاتی ہے۔ کائناتِ ارضی و سماوی کی ابتدا بھی وحدت سے ہوئی اور یہ منتج بھی وحدت پر ہونے والی ہے۔ اسی طرح انسانی تخلیق کی ابتدا بھی وحدت سے ہوئی، پھر یہ وحدت بڑھتے بڑھتے اجتماعیت کی صورت اختیار کر گئی۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش (کی ابتداء) ایک جان سے کی پھر اسی سے اس کا جوڑ پیدا فرمایا پھر ان دونوں میں سے بکثرت مردوں اور عورتوں (کی تخلیق) کو پھیلا دیا۔

---

(۱) النساء، ۴:۱

یہ فرمانِ الٰہی بھی اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ انسان کی تخلیق بھی نفسِ واحدہ یعنی وحدت سے ہوئی ہے۔ پھر یہ وحدت کثرت میں تبدیل ہوتی گئی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اجتماعیت کا روپ اختیار کر گئی۔ غور کیا جائے تو وہ اپنے اندر پوری کائنات رکھتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ.(1)

ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذاتوں میں دِکھا دیں گے۔

اس آیتِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو مظاہر تمہیں آفاق میں دکھائی دیتے ہیں وہ خود تمہارے اندر بھی موجود ہیں۔ جب انسان باہر کے عالم کو اپنے اندر کی دنیا کے تابع کرتا ہے تو وہ خود بخود اللہ اور اس کے محبوب کے تابع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنے قلب کی دنیا کو باہر کی دنیا کے تابع کر دے تو پھر وہ اَحْسَنِ تَقْوِيْم کی بلندیوں سے گر کر اَسْفَلَ سَافِلِيْن کی پستیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی خلقت کا تعلق ہے اس کی ابتداء بھی ایک single cell یعنی ایک وحدت سے ہوئی ہے اور اس کی انتہا بھی وحدت پر ہی ہونے والی ہے۔ عربی کا معروف محاورہ ہے:

كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ إِلٰى أَصْلِهٖ.

ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

چنانچہ ہر شے ابتدا میں اپنے سفر کا آغاز وحدت سے کرتی ہے تو وہ درجہ بہ درجہ اجتماعیت کے سانچوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ جب یہ اجتماعیت کے رنگ و بو اور انواع و اقسام میں پرورش پا کر اپنے منتہائے کمال پر پہنچتی ہے تو پھر وہاں سے وحدت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انسان کی ابتدا، جس وحدت سے ہوئی ہے اس کی انتہا بھی اسی وحدت سے منسلک ہے۔

---

(1) فصلت، 41:53

۲۔ فلسفہ وحدت و اِجتماعیت اور تخلیقِ کائنات

فلسفہ وحدت و اجتماعیت اور تخلیقِ کائنات کے حوالے سے اگر قرآن حکیم کا مطالعہ کریں تو بہت سے عقدے عیاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے اللہ رب العزت نے ام الکتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

اَوَ لَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰـہُمَا.[۱]

کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔

مذکورہ بالا آیتِ قرآنی اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ اللہ رب العزت نے سماوی و ارضی کائنات کو ایک اکائی میں پیدا فرمایا۔ یعنی زمینی اور آسمانی کائنات دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور جڑی ہوئی تھیں، پھر جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو انہیں پھاڑ کر جدا جدا کر دیا، جسے سائنس دان big bang theory کا نام دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو وحدت سے اجتماعیت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے تو وہ صرف کُن کا حکم فرماتا ہے تو وہ خودبخود فیکون یعنی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ big bang theory کے خالق سائنس دان جسے دھماکے کا نام دیتے ہیں، وہ دراصل رب کائنات کا حکم کُن (ہو جا) تھا، فَیَکُوۡن (سو ہو گیا)۔ جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشادِ مبارکہ ہے:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ○[۲]

اس کا امر (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے (اور ہوتی چلی جاتی ہے)○

سورۃ الانبیاء کی زیر بحث آیت اس حقیقت کو طشت از بام کر رہی ہے کہ ابتدا میں

(۱) الأنبياء، ۲۱:۳۰

(۲) يٰسين، ۳۶:۸۲

اکائی باہم پیوست اور متحد تھی اور اس پر رَتْق کا فیض جاری تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، کوئی میرا بھی مظہر ہو تو اس نے اجتماعیت کو وجود بخشا۔ اللہ رب العزت ہی وحدت سے اجتماعیت کو جنم دیتا ہے اور اجتماعیت کو پھر وحدت پر منتج کرتا ہے۔ جب وحدت اپنے مقام پر پہنچتی ہے تو پھر وحدت کو بھی ایک وحدت عطا فرماتا ہے۔ وہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ کے علم میں ہوتی ہے۔

تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ سائنس دانوں نے تخلیق کائنات کے بارے میں مختلف زمانوں میں اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اس حوالے سے معروف سائنس دان نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ کائنات جامد اور غیر متغیر ہے۔ 1915ء میں البرٹ آئین سٹائین نے نیوٹن کے اس فلسفے کو ردّ کر دیا۔ اسے کائنات کے اندر کچھ مادے اور توانائیاں نظر آئیں اور ان کے درمیان ایک باہمی نسبت بھی واضح ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قوت کے شواہد دکھائی دیے جو انہیں باہم جوڑے ہوئے ہیں۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ نہ ہونے کے سبب وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ انہیں جوڑنے والا وہی تو ہے جس نے اسے بنایا تھا۔

1929ء میں ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے اس مفروضے کو مزید فروغ بخشا۔ اس نے کہا کہ یہ کائنات جامد اور غیر متغیر نہیں ہے بلکہ یہ حرکت پذیر اور مسلسل وسعت پذیر ہے۔ یہاں اس نے پھر اجتماعیت کی بات کر دی اور بگ بینگ نظریے کا تصور دیا، مگر ابھی یہ نظریہ اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ بعد ازاں آنے والے سائنس دانوں نے اس نظریے پر مزید کام کیا جن میں Arno Penzias اور Robert Wilson جیسے امریکی سائنس دان بھی شامل ہیں۔ انہوں نے 1965ء میں ایک cosmic background radiation دریافت کی۔ اس سے وہ حتمی طور پر اس نتیجے تک پہنچ گئے کہ کائنات کی ابتدا ایک اکائی سے ہوئی ہے۔

جیسے پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہر اجتماعیت کی ابتدا وحدت سے ہوتی ہے اور اجتماعیت کی انتہا بھی وحدت ہی ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ انسان کی ابتدا بھی وحدت سے ہوئی ہے، انتہا بھی وحدت ہی ہے اور درمیان کا مرحلہ اجتماعیت میں گزرتا ہے۔ وحدت میں جو سِر ہوتا ہے اور وہ

سر خواص کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے وحدت کو سمجھانے کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام کی اجتماعیت بھیجی پھر ان سب کو سمجھانے کے لیے وحدتِ مصطفیٰ ﷺ عطا فرما دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جنہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار مقدس نفوس سے سمجھ نہیں آئی وہ وحدتِ درِ مصطفیٰ ﷺ پر سر تسلیم خم کر دیں تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔

سائنس دانوں نے اس اکائی کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کے اندر تو بڑی کشش، کرنیں اور توانائیاں ہیں۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے جن پر حقیقت کا راز کھول دیا وہ اکائی کی حقیقت کو جان گئے، جن پر راز نہیں کھولا ان کے لئے اجتماعیت رکھ دی۔ درج ذیل حدیثِ قدسی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا، فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ، فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِأُعْرَفَ.[1]

میں ایک مخفی خزانہ تھا چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا فرمایا۔

یہاں کُنتُ کنزا مَخفِیًّا کا بیان دراصل بیانِ وحدت ہے۔ پھر عالمِ خلق کو پیدا فرما کر اسی شان کا ظہور اجتماعیت کی شکل میں عیاں فرما دیا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ہر چیز کی ایک جداگانہ شناخت اور اپنا ایک وجود ہوتا ہے۔ اس کی کچھ خوبیاں اور کچھ خصلتیں ہوتی ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان چیزوں کی شناخت کو ختم نہیں کیا بلکہ وحدت میں چھپا کر رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کا آزادانہ وجود تھا، مگر وہ سب ایک اکائی میں ضم تھے۔ اس اکائی نے چاہا کہ اسے پھیلا دیا جائے۔ وہ آزادانہ وجود خود اکائی سے باہر جا کر وسعت اختیار نہیں کر سکتا تھا، وہ مکمل طور پر اس وحدت کے تابع تھا۔ جب وحدت نے اپنی شان ربوبیت کا اظہار کرنا چاہا تو ان کو تربیت میں رکھ کر اجتماعیت کا فیض عطا فرما دیا۔ اب بات وہاں تک ختم نہیں کی بلکہ تخلیقِ کائنات کو وسعت دیتا چلا گیا۔ جیسے فرمایا گیا:

(۱) ۱۔ آلوسی، روح المعانی، ۱۷:۱۲۱

۲۔ إسماعيل حقی، روح البیان، ۱:۱۱۳

اَللهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ. (۱)

اللہ (ہی) ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین (کی تشکیل) میں بھی انہی کی مِثل (تہ بہ تہ سات طبقات بنائے)۔

اس کی ربوبیت کے مظاہر قرآن حکیم میں جگہ جگہ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ. (۲)

اور تخلیق میں جس قدر چاہتا ہے اضافہ (اور توسیع) فرماتا رہتا ہے۔

دوسرے مقام پر سواریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ○ (۳)

وہ (مزید ایسی با زینت سواریوں کو بھی) پیدا فرمائے گا جنہیں تم (آج) نہیں جانتے○

پھر کوہ ساروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ. (۴)

اور اُس کے اندر (سے) بھاری پہاڑ (نکال کر) اس کے اوپر رکھ دیے اور اس کے اندر (معدنیات، آبی ذخائر، قدرتی وسائل اور دیگر قوتوں کی) برکت رکھی اور اس میں (جملہ مخلوق کے لیے) غذائیں (اور سامانِ معیشت) مقرر فرمائے (یہ سب کچھ

(۱) الطلاق، ۶۵:۱۲

(۲) فاطر، ۳۵:۱

(۳) النحل، ۱۶:۸

(۴) فصلت، ۴۱:۱۰

اس نے) چار دنوں (یعنی چار ارتقائی زمانوں) میں مکمل کیا۔

یہ تخلیقِ کائنات کے حوالے سے چند مثالیں بیان کی گئی ہیں، وگرنہ یہ وسیع و عریض کائنات اس کی قدرتوں کے عظیم مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ ان مظاہر کو حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوْهَا. (۱)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں پورا شمار نہ کر سکو گے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ اس اجتماعیت کو قائم کرنے کے لیے تو ایک یکسانیت مقصود تھی جو اس وحدتِ کبریٰ میں فنا ہو۔ اس یکسانیت کو آپ وحدت صغریٰ کہہ سکتے ہیں۔ یہ وحدتِ صغریٰ اس اجتماعیت کو قابو کرتی ہے چنانچہ اس اجتماعیت کے سارے کارکن اپنی اپنی ذات میں وحدت بھی رکھتے ہیں، مگر پھر مجتمع ہو کر اس وحدتِ کبریٰ میں ضم بھی ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے کہ جہاں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی نگاہ دور بیں اس کائنات کی تخلیق کے ارتقا اور اس کی expansion پر پڑی تو بے اختیار پکار اٹھے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

وہ اس راز کو پا گئے کہ یہ ساری کُنْ فَیَکُوْن کی کارفرمائی ہے۔ یہاں تک ہم نے اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کی ابتدا وحدت سے ہوئی، پھر ہم نے اجتماعیت کی شان بھی ملاحظہ کرلی۔ جب یہ اجتماعیت اپنے منتہائے کمال کو پہنچے گی تو پھر وحدت میں گم ہوجائے گی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ. (۲)

---

(۱) النحل، ۱۶: ۱۸

(۲) الأنبياء، ۲۱:۱۰۴

جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلی بار پیدا کیا تھا ہم (اس کے ختم ہو جانے کے بعد) اسی عملِ تخلیق کو دہرائیں گے۔

یعنی جیسے ہم نے اُسے پہلے تخلیق کیا تھا اس کے ختم ہونے کے بعد پھر ہم تخلیق کے اور اس مرحلے کو دوبارہ شروع کریں گے۔

اس دن سماوی کائنات کو ایسے لپیٹ دیا جائے گا جیسے لکھے ہوئے کاغذات کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔ سب کچھ ختم ہو کر دستِ قدرت میں لپیٹا ہوا کاغذ ہو جائے گا۔ پھر فرمایا جس طرح کائنات کو وحدت سے پہلی بار پیدا کیا تھا، اسی طرح کائنات کے ختم ہو جانے کے بعد اسے پھر دوبارہ تخلیق کیا جائے گا۔

۳۔ فلسفہ وحدت و اجتماعیت اور تخلیقِ انسانی کا بیان

فلسفہ وحدت و اجتماعیت انسانی زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ ایک زاویہ سے دیکھیں تو انسان جب وحدت میں ہوتا ہے تو متمکن ہونے کے لئے جس جگہ پر وہ قیام پذیر ہوتا ہے یا جس معاشرے کا وہ حصہ بنتا ہے یا جہاں وہ اپنا مقام بناتا ہے تو یہ سب کچھ پہلے دن ہی سے نہیں بن جاتا۔ وہ مقام جو اس کے ذہن میں ہوتا ہے وہ فوراً اسے نہیں مل جاتا بلکہ وہ اسے بتدریج جد و جہد سے حاصل کرتا ہے یعنی یہ سب معاملات درجہ بہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پہلے ہی دن اسے بلند مناصب پر فائز نہیں کر دیا جاتا۔

تحریکی زندگی کی طرف نظر دوڑائیں تو کوئی بھی پہلے دن ہی رہنما نہیں بن جاتا۔ اسی طرح تحریک بھی بذاتِ خود مختلف مراحل طے کرتی ہے۔ اسے بھی فکری، نظریاتی اور اعتقادی بلوغت کے مختلف مراحل بتدریج طے کرنا پڑتے ہیں۔ کارکن کے طور پر وہ تنظیم کے مشن کی گھر گھر دعوت دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو تنظیمی اجتماع میں شمولیت کے لئے بھرپور تگ و دو کرتا ہے اور مقررین کو اسٹیج پر بٹھاتا ہے۔ تنظیم اور اس کے مشن سے اس کی وابستگی پر اس کی استقامت آخر کار اسے ایک دن سٹیج پر مسندِ خطابت کے لئے بٹھا دیتی ہے اور درجہ بہ درجہ مختلف عہدوں سے

ہوتا ہوا تنظیم کا سربراہ منتخب ہو جاتا ہے۔ یہ مقام اسے اللہ تعالیٰ ایسے ہی عطا نہیں فرماتا، بلکہ اس میں اس کی شبانہ روز استقامت اور اخلاص کے ساتھ مسلسل جد و جہد شامل ہوتی ہے۔ بڑے بڑے نام ور رہنما ابتدا میں ایک ادنیٰ سے کارکن تھے پھر بتدریج جد و جہد کے نتیجے میں وہ ملک کے سربراہ کے منصب تک جا پہنچے۔ اسی طرح انسان کی اپنی تخلیق بھی مختلف مراحل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ماں کے شکم میں تو ایسا انسان نہیں تھا جو اب نظر آتا ہے۔ بلکہ اس سے قبل وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ سورہ الدھر میں خود قرآن حکیم فرماتا ہے:

لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا○(۱)

وہ کوئی قابلِ ذِکر چیز ہی نہ تھا○

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر تخلیق انسانی کے حوالے سے وحدت سے جماعت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ. وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْرًا وَّنِسَآءً.(۲)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش (کی ابتدا) ایک جان سے کی۔ پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا فرمایا پھر ان دونوں میں سے بکثرت مردوں اور عورتوں (کی تخلیق) کو پھیلا دیا۔

یہاں نفسِ واحد سے مراد zygote ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو zygote سے پیدا کیا یعنی اُس cell اور اُس egg سے پیدا کیا، جسے fertilized ovum بھی کہتے ہیں۔ پھر اس میں سے جوڑے پیدا کیے۔ اس طرح سے نر واحد کی تعداد دو میں تقسیم ہوگئی۔ پھر ان دو cells کو مزید تقسیم کرتا چلا گیا۔ پھر اس میں سے کثرت کے ساتھ مردوں اور عورتوں کو پیدا کرنے کا

(۱) الدھر، ۷۶: ۲

(۲) النساء، ۴: ۱

سلسلہ شروع کر دیا۔ اب آگے mitotic division کا process شروع ہوا۔ انسان کو ایک جان یعنی singular cell سے پیدا کیا، پھر اسے اجتماعیت میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ ایک cell تھا تو وہ وحدت کے جمال میں تھا مگر اس کو کوئی جانتا نہ تھا۔ پھر اسے mitotic division میں تقسیم کر دیا۔ اس میں پھر prophase، metaphase، anaphase، telophase اور interphase ہیں۔ یہ سارے فیز اپنا الگ الگ عنوان بھی رکھتے ہیں اور وجود بھی۔ یہ اپنی شناخت بھی رکھتے ہیں اور اپنی specification بھی، مگر اُن سب کو اس نفسِ واحد میں جمع کر کے رکھا تھا، تب انہیں تقسیم کر دیا۔ پہلے معلوم نہیں تھا کہ اس میں نر cell کون سا اور مادہ cell کون سا ہے۔ جب اجتماعیت عطا ہوئی تو پھر سمجھ آنے لگی کہ کون کیا ہے؟ اب نظام ربوبیت کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے اسے قرآن حکیم میں یوں منکشف فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۝(۱)

اور بے شک ہم نے انسان کی تخلیق (کی ابتدا) مٹی (کے کیمیائی اجزا) کے خلاصہ سے فرمائی۝

اللہ رب العزت نے انسان کو مٹی کے جوہر کے کیمیائی مادے سے تخلیق کیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۝(۲)

پھر اسے نطفہ (تولیدی قطرہ) بنا کر ایک مضبوط جگہ (رحم مادر) میں رکھا۝

اس کے اگلی آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

---

(۱) المومنون، ۲۳:۱۲

(۲) المومنون، ۲۳:۱۳

الْخٰلِقِيْنَo[1]

پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلّق وجود بنا دیا، پھر ہم نے اس معلّق وجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے، پھر ہم نے اس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت (اور پٹھے) چڑھائے، پھر ہم نے اسے تخلیق کی دوسری صورت میں (بدل کر تدریجاً) نشوونما دی، پھر (اس) اللہ نے (اسے) بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہےo

اب اس مخلوق کو دیکھیں، نہ تو وہ نُطْفَة نظر آتا ہے اور نہ عَلَقَة، نہ مُضْغَة نظر آتا ہے اور نہ ہی عِظٰم نظر آتا ہے اور نہ ہی لَحْم نظر آتا ہے۔ اللہ رب العزت جیسے جیسے مرحلے بدلتا ہے، ویسے ویسے عنوان بھی بدلتے چلے جاتے ہیں۔ جب مراحل بدلتے ہیں تو اس کے ساتھ صفات بھی بدلتی چلی جاتی ہیں۔ اللہ رب العزت جب وحدت سے اجتماعیت کا فیض عطا فرماتا ہے تو پھر وحدت کی جگہ اجتماعیت کو ظہور میں لاتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ اللہ رب العزت اپنی شانِ ربوبیت کا اظہار اجتماعیت کی شکل میں کس طرح درجہ بدرجہ ظاہر فرما رہا ہے۔

وحدت نکرہ کی اور اجتماعیت معرفہ کی مظہر ہے

اب ایک اور زاویے سے دیکھیں کہ انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل مثلاً نُطْفَة، عَلَقَة، مُضْغَة، عِظٰم اور لَحْم سب مختلف عنوانات کے تحت جمع ہو کر بھی وحدت میں تھے کیونکہ یہ سب ایک ہی انسان کے لئے مرحلہ وار تشکیل پا رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ رحمِ مادر کے اندر بھی وہ وحدت میں تھا کیونکہ وہ ایک انسان تھا۔ مگر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ یہ انسان تو کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھا جیسا کہ سورۃ الدہر کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے۔ نُطْفَة کی حقیر بوند سے اس کا آغاز ہوا، نُطْفَة ایک واضح شے تھی اس میں کوئی ابہام نہیں۔ لیکن اسے نکرہ سے معرفہ یعنی النُّطْفَة بنا کر شک سے بالاتر کر دیا۔ پھر اللہ رب العزت نے اسے عَلَقَة کی کیفیت میں

---

(۱) المومنون، ۲۳: ۱۴

داخل کر دیا یعنی رحم مادر میں جونک کی صورت میں معلق وجود بنا دیا۔ اسے ابھی کوئی شکل اور صورت نہیں ملی تھی۔ وہ ثبات و استقرار سے محروم تھا، اس کے تمام خصائص و اوصاف ابھی واضح نہیں ہوئے تھے۔ قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً.[۱]

پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلّق وجود بنا دیا۔

جب اسے تمکن اور ثبات مل گیا اور اُسے معلق وجود (hanging mass) کی پوری کیفیت نصیب ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے معرفہ بناتے ہوئے ال کے اضافہ کے ساتھ الْعَلَقَة قرار دے دیا۔ ارشاد فرمایا:

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً.[۲]

پھر ہم نے اس معلّق وجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے۔

جو شے تکمیل کے ابتدائی مراحل میں ہو اسے اللہ رب العزت معرفہ نہیں کہتا، بلکہ وہ نکرہ ہوتی ہے۔ جب تک وہ ارتقائی مراحل سے گزر کر حالتِ تامہ تک نہ پہنچے جس پر اسے نام دیا جاسکے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اسے نکرہ رکھتا ہے۔ چنانچہ جب نطفہ کو معرّف کیا تو اسے النُّطْفَة کہا اور اسی طرح عَلَقَة کو جب معرف کیا تو الْعَلَقَة کہا ۔اسی طرح جب تک مُضْغَة کو کوئی شکل نہ ملی اسے نکرہ کے تحت رکھا اور جب اُسے شکل مل گئی تو فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ کہا یعنی ال لگا کر معرف کر دیا۔ چنانچہ فرمایا:

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا.[۳]

---

(۱) المومنون، ۲۳: ۱۴

(۲) المومنون، ۲۳: ۱۴

(۳) المومنون، ۲۳: ۱۴

پھر ہم نے اس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا۔

ابھی تک ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا تھا اس لیے اسے نکرہ میں رکھا۔ جب ارتقائی منازل طے کر کے مکمل شکل اختیار کر لیتا ہے تو فرمایا:

فَكَسَوْنَا الْعِظٰـمَ لَحْمًا. [۱]

پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت (اور پٹھے) چڑھائے۔

ابھی لَحم مکمل نہیں ہوا، اسے پھر مراحل سے گزارا۔ اس مقام پر فرمایا:

ثُمَّ اَنْشَاْنٰـهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰـرَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَo [۲]

پھر (اس) اللہ نے (اسے) بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہےo

لَحم جب مکمل ہو گیا تو وہ انسان کی مکمل شکل اختیار کر گیا۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس سنت کا اظہار ملتا ہے کہ جب تک انسان کے اندر جمیع اوصاف و کمالات، خوبیاں اور خصلتیں بتمام و کمال جمع نہ ہو جائیں تب تک اسے نام نہیں دیتا۔ جب تک نُطْفَة تھا وہ وحدت میں رہا، کسی نظام کا حصہ نہ بنا۔ جب اس میں اجتماعیت کی تمام خوبیاں شامل ہو گئیں تو پھر اسے اس کی حیثیت کے مطابق نام دے دیا گیا۔

یاد رہے کہ وحدت اپنی ذات میں اجتماعیت رکھتی ہے۔ جب وہ وحدت یقین کے ساتھ سارے مراحل گزار لے تب اس پر لقب (title) کا اعلان کیا جاتا ہے۔

یوں رب العزت نے اس مخلوق کے اندر بھی ایک وحدت کو چھپائے رکھا۔ جب بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو اس وقت تنہا ہوتا ہے، کیونکہ رحمِ مادر میں اسے پالنے والا، خوراک دینے والا اور اسے زندہ رکھنے والا واحد تھا۔ یعنی وہ خدائے وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کے کنٹرول میں تھا۔

---

(۱) المومنون، ۲۳: ۱۴

(۲) المومنون، ۲۳: ۱۴

ہر بچہ جب وحدت سے اجتماعیتِ دنیا میں آتا ہے تو اپنے رب سے جدائی کے باعث روتا ہوا آتا ہے۔ اس کا یہ رونا اس لیے ہوتا ہے کہ وہاں وہ براہِ راست وحدت کے جام پیتا تھا اور ملاء اعلیٰ کے نظارے کرتا تھا۔ وہ پھر اس لیے ہنستا ہے کہ اس کا ایک تعلق ابھی بھی قائم ہے، جب کبھی ملاء اعلیٰ کے نظارے دیکھتا ہے تو کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ اب اس دنیا کا باشندہ ہو گیا ہے تو اس کی وحدت کو اجتماعیت میں بدل دیا گیا ہے۔ اب وہ بچہ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب اس بچے کی بقا اسی اجتماعیت میں ہے۔ اب ماں اسے پالتی ہے۔ جب بندہ محتاج ہو جائے سمجھ لیں وہ اجتماعیت میں آیا ہے۔ کیونکہ اگر وحدت زندہ ہوتی، اس کا توکل اپنے رب پر ہوتا تو وہ کسی دوسرے کا محتاج نہ ہوتا۔ اب توکل اجتماعیت کا ہے تو محتاج بنا پھرتا ہے۔ جب وہ بچہ بڑھتا ہے تو اسے استاد چاہیے جو اسے تعلیم دے، پھر اسے معالج چاہیے تاکہ بیمار ہو تو اس کا علاج کرے۔ اسے ایک معاشرہ چاہیے جہاں وہ اپنی بود و باش کا بندوبست کر سکے اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکے۔ جب وہ عالمِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس کی اولاد ہوتی ہے جن سے محبت کر کے وہ اپنی وحشت کو دور کرتا ہے۔ اللہ رب العزت اس طرح اسے اجتماعیت میں رکھتا ہے۔ اس انسان پر صد افسوس ہے جو مال و متاع کو جمع کرنے کی حرص نے اسے آخرت سے غافل کر دیا ہے اور وہ بھول گیا ہے کہ ایک دن اسے موت کا ذائقہ چکھ کر قبر میں بھی جانا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُo حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَo [(۱)]

تمہیں کثرتِ مال کی ہوس اور فخر نے (آخرت سے) غافل کر دیاo یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچےo

وہ بچہ جب عرصۂ وحدت میں تھا تو اس کا کامل توکل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر تھا۔ اس کے برعکس جب اجتماعیت میں آیا تو وہ سب کا محتاج ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ وہ اپنے جنازے کو قبر تک پہنچانے کے لیے بھی اسی معاشرے کا محتاج ہے۔ اگر وہ اجتماع میں نہ رہے تو

(۱) التکاثر، ۱۰۲: ۱-۲

کوئی اس کا جنازہ بھی اٹھانے والا نہ ہو۔ بعد ازاں جب وہ قبر میں جاتا ہے تو پھر واحد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں وحدہ لا شریک له کے ساتھ استوار کیا ہوا رشتہ ہی اس کے کام آتا ہے۔

۴۔ وحدت و اجتماعیت اور قلبِ انسانی

انسان کو جب قبر کی تنہائی سے اٹھایا جائے گا تو پھر وہ واحد نہیں رہے گا۔ روزِ محشر اسے پھر اجتماعیت میں ڈال دیا جائے گا۔ اللہ رب العزت نے جب اَعضاے انسانی کو پیدا فرمایا تو پورے جسم کے اہم اعضاء کو زوج میں پیدا فرمایا۔ خالقِ جن و انس نے دو آنکھیں بنائیں، دماغ کے بھی دو hemisphere بنائے، دو ہاتھ بنائے، دو پاؤں بنائے، دو ٹانگیں بنائیں، دو گردے بنائے اور دو ہی پھیپھڑے بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ جوڑوں میں پیدا فرمایا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کو اجتماعیت میں پیدا کیا مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس اجتماعیت کے اندر دل ایک ہی رکھا۔ اجتماعیت کا مفاد یہ ہے کہ اگر اس میں سے ایک عضو تلف بھی ہو جائے تو اجتماعیت باقی رہتی ہے مگر قلب ایک ہی رکھا کیونکہ اس کی حیثیت مرکزی ہے۔ انسانی جسم میں قلب کی مرکزی حیثیت کو درج ذیل حدیث مبارک میں بڑی خوب صورتی سے بیان فرمایا گیا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَلاَ! وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ! وَهِيَ الْقَلْبُ. (۱)

آگاہ ہو جاؤ! بے شک جسم میں ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، آگاہ ہو جاؤ! وہ دل ہے۔

دل چونکہ حق تعالیٰ کی خلوت گاہ ہے اس لئے اس کی نظر ہمیشہ بندے کے قلب کی طرف رہتی ہے کہ مولیٰ کے تعلق میں کس قدر اخلاص کا حامل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت

---

(۱) مسلم، الصحیح، کتاب المساقاۃ، باب أخذ الحلال وترک الشبہات، ۳:۱۲۱۹، رقم:۱۵۹۹

کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلٰى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ. (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نہ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہاری صورتوں کو، بلکہ وہ تمہارے دلوں (اور اِن میں موجود نیتوں) کو دیکھتا ہے۔

ایک اور روایت میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ. (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور تمہارے اَموال کو نہیں بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اَعمال کو دیکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل کو اپنے لیے رکھا ہے اور بقیہ جسم کو اجتماع کے لیے

---

(۱) مسلم، الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله، ۴:۱۹۸۶، رقم:۲۵۶۴
۲۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۷:۵۰۸، رقم:۱۱۱۵۱

(۲) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله، ۴:۱۹۸۷، رقم:۲۵۶۴
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲:۲۸۴، ۵۳۹، رقم:۷۸۱۴، ۱۰۹۷۳
۳۔ ابن ماجه، السنن، كتاب الزهد، باب القناعة، ۲:۱۳۸۸، رقم:۴۱۴۳
۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۲:۱۱۹، رقم:۳۹۴
۵۔ ابن المبارك، الزهد:۵۴۰، رقم:۱۵۴۴
۶۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۷:۳۲۸، رقم:۱۰۴۷۷
۷۔ ديلمي، مسند الفردوس، ۱:۱۶۶، رقم:۶۱۴

رکھا۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے جسم کو حقوق العباد کے لیے رکھا ہے اور قلب یعنی دل کو حقوق اللہ کے لیے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے میرا حق جسم سے نہیں دل سے چاہیے یہی وجہ ہے کہ جسم کی خطا قابل معافی ہے مگر قلب کی خطا قبول نہیں، کیونکہ قلب کو وحدہ لاشریک سے منسلک کر کے واحد رکھا تھا۔

انسان جب اپنا دل دنیا میں لگا کر اپنے مالک کو بھول جاتا ہے تو مرنے کے بعد اسے کہا جاتا ہے: اے مرنے والے! تو میرے دل کو دنیا کے لیے چھوڑ آیا اور جسم کو قبر میں میرے لیے لے آیا! تیرے جسم سے مجھے کوئی غرض نہیں مجھے تو تیرا دل چاہیے تھا یعنی اس دل کی خالصیت ورع، صدق اور محبت چاہیے تھی۔

دل کی مثال اس برتن کی سی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جو ارض و سما میں نہیں سماتا وہ مومن کے دل کے برتن میں سما جاتا ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی درج ذیل حدیث مبارکہ میں اس کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی فِي الْأَرْضِ أَوَانِيَ، أَلاَ وَهِيَ الْقُلُوْبُ، فَأَحَبُّهَا إِلَی اللهِ أَرَقُّهَا وَأَصْفَاهَا وَأَصْلَبُهَا. (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک زمین پر اللہ تعالیٰ کے کچھ برتن ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! وہ (اللہ کے عبادت گزار بندوں کے) دل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو بہت نرم، بہت صاف اور بہت مضبوط و مستحکم ہوں۔

عتبہ خولانی سے مروی مرفوع روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ لِلّٰهِ آنِيَةً مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ، وَآنِيَةُ رَبِّكُمْ قُلُوْبُ عِبَادِهِ الصَّالِحِيْنَ، وَأَحَبُّهَا إِلَيْهِ أَلْيَنُهَا وَأَرَقُّهَا. (۲)

(۱) حکیم ترمذی، نوادر الأصول، ۴:۱۰۰

(۲) طبرانی، مسند الشامیین، ۲:۱۹، رقم: ۸۴۰

بے شک زمین پر اللہ تعالیٰ کے کچھ برتن ہیں۔ اور تمہارے رب کے برتن اس کے صالح وعبادت گزار بندوں کے دل ہوتے ہیں؛ اور ان میں سے بھی اُسے زیادہ محبوب وہ قلوب ہوتے ہیں جو بہت نرم اور بہت صاف و شفاف ہوں۔

انسان اپنے برتنوں کو اُجلا اور صاف رکھتا ہے لیکن دل جو اللہ کا برتن ہے اس کے اجلا اور صاف ہونے سے الا ما شاء اللہ کوئی غرض نہیں رکھتا۔ جن کے دل صحیح معنوں میں اجلے، نکھرے اور صاف ستھرے تھے وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، جن کی تعریف خود قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا. (۱)

(وہ) کافروں پر بہت سخت اور زور آور ہیں آپس میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں۔ آپ انہیں کثرت سے رکوع کرتے ہوئے، سجود کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ (صرف) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حق پر استقامت کا ذکر ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ. (۲)

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اترتے ہیں۔

ان پر ملائکہ اس لیے اترتے ہیں کہ ان کے دل خدا کے برتن ہوتے ہیں۔ جو طہارت، اخلاص اور زہد و ورع کا پیکر ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے ملائکہ کو بھیجتا ہے کہ میرے ان بندوں کو خوش خبری سناؤ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو چکی ہے، لہٰذا اب تمہارے نزدیک نہ

---

(۱) الفتح، ۴۸:۲۹

(۲) حم السجدہ، ۴۱:۳۰

کوئی غم آ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی خوف۔ تمہارا ابدی ٹھکانا جنت ہے۔ ہم اس دنیا میں تمہارے دوست و مددگار ہیں اور آخرت میں بھی تمہیں ہماری ہر نعمت میسر ہوگی۔

۵۔ وحدتِ نورِ مصطفیٰ ﷺ

اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اصل نکتۂ وحدت کیا تھا جس کے سبب پوری کائنات کو تخلیق فرمایا گیا۔ یاد رکھیں وہ نکتہ جو وجۂ تخلیقِ کائنات ہے، وہ درحقیقت نکتۂ وحدتِ نور مصطفیٰ ﷺ ہے۔ یہ کائناتِ ہست و بود، سماوی و ارضی کی ابتدا جس نکتہ سے ہوئی وہ نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی تھا۔ اس حقیقت کا اشارہ حدیثِ مبارکہ سے ملتا ہے جسے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي، أَخْبِرْنِي عَنْ أَوَّلِ شَيءٍ خَلَقَهُ اللهُ تَعَالٰی قَبْلَ الْأَشْيَاءِ؟ قَالَ: يَا جَابِرُ، إِنَّ اللهَ تَعَالٰی قَدْ خَلَقَ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ نُوْرَ نَبِيِّکَ مِنْ نُوْرِهٖ، فَجَعَلَ ذٰلِکَ النُّوْرَ يَدُوْرُ بِالْقُدْرَةِ حَيْثُ شَاءَ اللهُ تَعَالٰی، وَلَمْ يَکُنْ فِي ذٰلِکَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَلَا قَلَمٌ، وَلَا جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ، وَلَا مَلَکٌ، وَلَا سَمَاءٌ وَلَا أَرْضٌ، وَلَا شَمْسٌ وَلَا قَمَرٌ، وَلَا جِنِّيٌّ وَلَا إِنْسِيٌّ. فَلَمَّا أَرَادَ اللهُ تَعَالٰی أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ قَسَمَ ذٰلِکَ النُّوْرَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ: فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ الْقَلَمَ، وَمِنَ الثَّانِيِّ: اللَّوْحَ وَمِنَ الثَّالِثِ: الْعَرْشَ. ثُمَّ قَسَمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْأَوَّلِ: حَمَلَةَ الْعَرْشِ، وَمِنَ الثَّانِيِّ: الْکُرْسِيَّ، وَمِنَ الثَّالِثِ: بَاقِيَ الْمَلَائِکَةِ. ثُمَّ قَسَمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْأَوَّلِ: السَّمٰوَاتِ، وَمِنَ الثَّانِيِّ: الْأَرَضِيْنَ وَمِنَ الثَّالِثِ: اَلْجَنَّةَ وَالنَّارَ. (۱)

(۱) ۱۔ قسطلانی نے ’المواهب اللدنية (۱:۷۱)‘ میں کہا ہے کہ اسے امام عبد الرزاق نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔

میں نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس شے کو پیدا فرمایا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق (کو پیدا کرنے) سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور (کے فیض) سے پیدا فرمایا، یہ نور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جہاں اس نے چاہا سیر کرتا رہا۔ اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت تھی نہ دوزخ، نہ (کوئی) فرشتہ تھا، نہ آسمان تھا نہ زمین، نہ سورج تھا نہ چاند، نہ جن تھے اور نہ انسان۔ جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ مخلوق کو پیدا کرے تو اس نے اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصہ سے قلم بنایا، دوسرے حصہ سے لوح اور تیسرے حصہ سے عرش بنایا۔ پھر چوتھے حصہ کو (مزید) چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے حصہ سے عرش اٹھانے والے فرشتے بنائے، دوسرے حصہ سے کرسی اور تیسرے حصہ سے باقی فرشتے پیدا کیے۔ پھر چوتھے حصے کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے حصہ سے آسمان بنائے، دوسرے حصہ سے زمین اور تیسرے حصہ سے جنت اور دوزخ بنائی۔

اس سے آگے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما روایت بیان کرتے ہیں کہ چوتھی قسم کو مقام محبت میں بارہ ہزار سال رکھا گیا، پھر اس کے مزید چار حصے کیے گئے۔ ان میں ایک سے قلم کو، دوسرے سے لوح کو اور تیسرے حصہ سے جنت کو پیدا کیا۔ بعد ازاں چوتھی قسم کو مقامِ خوف میں

۲۔ زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۱:۸۹-۹۱

۳۔ عجلونی نے 'کشف الخفاء (۱:۳۱۱، رقم:۸۲۷)' میں کہا ہے کہ اسے امام عبد الرزاق نے اپنی سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۴۔ عیدروسی نے 'تاریخ النور السافر (۱:۸)' میں کہا ہے کہ اسے امام عبد الرزاق نے اپنی سند سے روایت کیا ہے

۵۔ حلبی، السيرة، ۱:۵۰

۶۔ تھانوی، نشر الطيب:۱۳

بارہ ہزار سال رکھ کر چار حصے کیے۔ ان میں سے ایک حصے سے فرشتوں کو، دوسرے سے سورج کو اور تیسرے حصے سے چاند اور ستاروں کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد چوتھے حصے کو مقامِ رجا میں بارہ ہزار سال رکھا اور اسے چار حصوں میں تقسیم فرمایا۔ ان میں سے ایک حصے سے عقل، ایک سے علم وحکمت، تیسرے سے عصمت و توفیق کو پیدا فرمایا۔ چوتھے حصے کو بارہ ہزار سال مقامِ حیا میں رکھا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف نظر فرمائی تو اس نور کو جلالت سے پسینہ آ گیا۔ اس سے نور کے ایک لاکھ چوبیس ہزار قطرے ٹپکے۔ اللہ رب العزت نے اس سے ٹپکنے والے ہر قطرے سے ایک نبی یا رسول کی روح کو پیدا فرمایا۔ بعد ازاں جب انبیاء کرام علیہم السلام کی روحوں نے سانس لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سانسوں سے قیامت تک ہونے والے اولیاء، شہداء، اربابِ سعادت اور اصحابِ اطاعت کو پیدا فرمایا۔

پس عرش اور کرسی میرے نور سے، فرشتے اور اصحابِ روحانیت میرے نور سے، جنت اور اس کی نعمتیں میرے نور سے، ساتوں آسمانوں کے فرشتے میرے نور سے، سورج، چاند اور ستارے میرے نور سے، رسولوں اور انبیاء کی روحیں میرے نور سے، شہداء، اولیاء اور صالحین میرے نور سے پیدا ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بارہ ہزار پردے پیدا فرمائے اور میرے نور یعنی چوتھے جز کو ہر پردے میں ایک ہزار سال رکھا۔ یہ عبودیت، سکینہ، صبر، صدق اور یقین کے مقامات تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس نور کو ان پردوں سے نکالا تو اسے زمین پر اتار دیا۔ جس طرح اندھیری رات میں چراغ سے روشنی ہوتی ہے عین اسی طرح اس نور سے مشرق سے لے کر مغرب تک فضا منور اور معطر ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے زمین سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو نور ان کی پیشانی میں رکھ دیا، ان سے وہ نور حضرت شیث علیہ السلام کی طرف منتقل ہوتا ہوا پاک صلبوں سے پاک رَحموں کی جانب منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی پشت مبارک تک پہنچا دیا اور وہاں سے ہماری والدہ حضرت آمنہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کے رحم کی طرف منتقل کیا۔ پھر ہمیں اس دنیا میں جلوہ گر کیا اور ہمیں رسولوں کا سردار، انبیاء کا خاتم، تمام جہانوں کے لئے، رحمت مجسم اور روشن اعضاء وضو والوں کا قائد بنایا۔

اس حدیث مبارک کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ نور مصطفیٰ ﷺ مطلقاً سب سے پہلے پیدا کیا گیا، باقی سب کچھ جو زمین اور آسمان اور ان دونوں کے درمیان موجود ہے، اپنے اپنے وقت پر بحکم الٰہی آپ ﷺ کے نور سے پیدا ہوتا چلا گیا۔ حضور ﷺ کا نور وحدت تھی جس کے فیض سے ساری کائنات کی اجتماعیت وجود میں آئی جو اَمر کُنْ فَیَکُوْن کے تحت تا قیامت دما دم ترقی پذیر ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا نور ہی اصل ہے اور باقی اجتماعیت کی شکل میں ساری کائنات اس کی فرع ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ ہر فضیلت کے آفتاب ہیں اور تمام روشنیاں آپ ﷺ کی تابانیوں سے پھوٹتی ہیں۔ جیسے ستارے اپنی روشنی سورج سے حاصل کرتے ہیں، عین اسی طرح یہ ساری اجتماعیت، چاہے یہ قلم کی شکل میں ہے یا لوح کی شکل میں، وہ زمین ہو یا آسمان، جن و انس ہوں یا ملائکہ ہوں، عرش و کرسی ہو، نباتات ہو یا جمادات و حیوانات ہوں، عالم ملکوت، عالم جبروت، عالم بشریت ہو یا نورانیت؛ یہ تمام کے تمام حضور نبی اکرم ﷺ کے نور کے تصدق سے وجود میں آئے ہیں۔

٦۔ میثاقِ اَنبیاء اور فلسفہ وحدت و اِجتماعیت

جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے نور کو انبیاء کرام علیہم السلام کے انوار کی طرف نظر کرنے کا حکم فرمایا اور خاتم المرسلین ﷺ کے نور نے انبیاء کرام علیہم السلام کے نور کی طرف نظر کی تو آپ ﷺ کا نور ان سب پر چھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان انوارِ انبیاء کو اذنِ گویائی عطا فرمایا تو انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! یہ کون سی مبارک ہستی کا نور ہے جو ہم سب پر چھا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ محمد بن عبداللہ (ﷺ) کا نور ہے۔ اگر تم ان کی رسالت پر ایمان لاؤ گے تو میں تم سب کو نبوت کے تاج سے سرفراز کروں گا۔ انہوں نے عرض کیا: ہم ان پر اور ان کی نبوت پر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کریمہ میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَo[1]

اور (اے محبوب! وہ وقت یاد کریں) جب اللہ نے انبیاء سے پختہ عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کر دوں پھر تمہارے پاس وہ (سب پر عظمت والا) رسول (ﷺ) تشریف لائے جو ان کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہو جو تمہارے ساتھ ہوں گی تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لاؤ گے اور ضرور بالضرور ان کی مدد کرو گے، فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور اس (شرط) پر میرا بھاری عہد مضبوطی سے تھام لیا؟ سب نے عرض کیا: ہم نے اِقرار کر لیا، فرمایا کہ تم گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوںo

اس آیت کریمہ میں وحدتِ رسالت مصطفیٰ ﷺ کا بیان ہے۔ انبیا و رسل علیہم السلام کی نبوت و رسالت کی اجتماعیت کا انحصار آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے سے مشروط ٹھہرا۔ گویا وحدت و اجتماعیت باہم پیوست ہیں اور انہیں کبھی بھی جدا جدا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ واقعہ معراج اور وحدتِ شانِ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ

معراج کی شب شانِ وحدت ذات مصطفیٰ ﷺ اس وقت اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئی جب مسجدِ اقصیٰ میں آپ ﷺ کی امامت میں تمام اَرواحِ انبیاء نے اجتماعیت کی شکل میں مقتدی بن کر نماز ادا کی۔ یہاں وحدت مصطفیٰ ﷺ کو انبیاء کرام علیہم السلام کی اجتماعیت کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب تمام انبیاء کی نبوتیں اپنی شریعتوں کے ساتھ ختم ہو چکی تھیں اور تمام انبیاء دیدارِ الٰہی کے شوق لیے اپنا اپنا وقت طے کر کے دنیا سے عالم ارواح کی طرف کوچ کر چکے

(۱) آل عمران، ۳:۸۱

تھے ۔ اللہ رب العزت نے وجہِ تخلیق کائنات اپنے محبوب مکرم ﷺ کو اپنے جمالِ لازوال سے مشرف کرنے کے لئے اپنے پاس بلایا۔ معراج کی رات کا ذکر قرآن حکیم میں یوں بیان کیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰـرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰـتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (۱)

وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرّب) بندے کو مسجدِ حرام سے (اس) مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تاکہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں، بے شک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے ۝

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی دیدار کی خواہش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دیدار کی تمنا کا ذکر قرآن حکیم میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ. (۲)

اے رب! مجھے (اپنا جلوہ) دکھا کہ میں تیرا دیدار کرلوں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَنْ تَرٰىنِيْ. (۳)

تم مجھے (براہِ راست) ہرگز دیکھ نہ سکو گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیدار کی خواہش سے منع نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ تم میں اس نورِ ازلی کو دیکھنے کی طاقت و صلاحیت نہیں ہے۔ یہ توفیق صرف اس محبوب مکرم ﷺ کو حاصل ہے جس کی خاطر بزم کائنات کو سجایا گیا اور جس کی نبوت کے آگے سرخم کرنے پر تمام

(۱) الاسراء، ۱:۱۷
(۲) الأعراف، ۱۴۳:۷
(۳) الأعراف، ۱۴۳:۷

انبیاء کو نبوت کا تاج عطا کیا گیا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی 'الفتوحات المکیۃ' میں لکھتے ہیں کہ ہر نبی علیہ السلام کو جو خصوصی نعمت بھی ملی وہ بہ اذنِ الٰہی حضور نبی اکرم ﷺ کے منبع جود و کرم سے ہی عطا ہوئی ہے۔ اللہ رب العزت نے عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو دنیا میں عیاں فرمایا۔ اس مقام کو شیخ اکبر نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

أَنْتَ ظَاهِرُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) فِي الدُّنْيَا وَبَاطِنُهُ فِي الْآخِرَةِ.

اے آدم! تو دنیا میں محمد (ﷺ) کا ظاہر ہے اور آخرت میں ان کا باطن ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں آدم علیہ السلام کو حضرت محمد ﷺ کا ظاہر کردے گا، اور جب آخرت میں بزم کائنات سجے گی تو پھر اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو باطن کر دے گا اور حضرت محمد ﷺ کو ان کا ظاہر کر دے گا۔ عام انسانی ذہن بیان کی گئی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اہلِ معرفت نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ابن عربی کے اس بیان سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے دنیا میں بھیجنے سے تیس کروڑ سال قبل نورِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنی بارگاہِ قرب میں چھپا کر رکھا۔ غیرت الٰہیہ کو گوارا نہ تھا کہ کوئی ناسمجھ حقیقت مصطفیٰ ﷺ کو نہ مان کر گستاخی کا مرتکب ہو اور قیامت اپنے وقت سے پہلے واقع ہو جائے۔ چنانچہ نورِ محمد ﷺ کو آدمیت کے پیکر میں ظاہر فرمایا۔ جب آخرت میں حقائق کے انکشافات کا دن بپا ہوگا تو حقیقتِ محمدی ظاہر کر دی جائے گی۔ اس وقت کسی کو بھی حقیقتِ محمدی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

اس مقام پر فلسفہ وحدت واجتماعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے وحدتِ مصطفیٰ ﷺ کو نور کی شکل میں تخلیق فرمایا گیا۔ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے ارواح انبیاء اور پھر ساری کائنات کو پیدا فرما کر اجتماعیت کو تشکیل دیا۔ جب یہ کائنات اَرضی منتہائے کمال کو پہنچی تو وحدتِ حسنِ مصطفیٰ ﷺ کا ظہور فرمایا۔ اب ہر شے میں وحدتِ حسنِ مصطفیٰ ﷺ کا نور نظر آنے لگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم اجتماعیت میں ہوتے ہیں تو اللہ رب العزت ہمیں اجتماعیت کا فیض عطا کرتا ہے۔ پھر

جب ہم وحدت میں آتے ہیں تو وحدت کا فیض عطا کرتا ہے۔ اجتماعیت میں بقا اور وحدت میں حیات ہے۔

۸۔ قبر میں وحدتِ حسنِ مصطفیٰ ﷺ کی پہچان کا سوال

جب انسان قبر میں جائے گا تو اس سے وحدتِ محمدی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ، وَتَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهُ وَإِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهِ، فَيَقُوْلَانِ: مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ ﷺ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ. فَيُقَالُ لَهُ: انْظُرْ إِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ، قَدْ أَبْدَلَكَ اللهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا. قَالَ: وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهُ: مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُوْلُ: لَا أَدْرِي، كُنْتُ أَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ، فَيُقَالُ: لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ، وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً، فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ. (۱)

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر، ۱:۴۶۲، رقم:۱۳۰۸

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال، ۱:۴۴۸، رقم:۱۲۷۳

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب التي یصرف بها في الدنیا أهل الجنة وأهل النار، ۴:۲۲۰۰، رقم:۲۸۷۰

۴۔ أحمد بن حنبل۔ المسند، ۳:۱۲۶، رقم:۱۲۲۹۳

۵۔ أبو داود۔ السنن، کتاب السنة، باب في المسألة في القبر وعذاب القبر، ۴:۲۳۸، رقم:۴۷۵۱

←

بندے کو (مرنے کے بعد) جب اس کی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی (تدفین کے بعد واپس) لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز بھی سن رہا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر کہتے ہیں: تو اس ہستی (یعنی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ) کے متعلق (دنیا میں) کیا کہا کرتا تھا؟ اگر وہ مومن ہو تو کہتا ہے: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے (کامل) بندے اور اس کے (سچے) رسول ہیں۔ اس سے کہا جائے گا: (اگر تو انہیں پہچان نہ پاتا تو) جہنم میں (تیرا جو ٹھکانہ ہوتا) اپنے اس ٹھکانے کی طرف دیکھ کہ اللہ تعالیٰ نے (معرفتِ مصطفیٰ ﷺ کے صلہ میں) اُسے جنت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں مقامات کا مشاہدہ کرے گا۔ اگر (مرنے والا) منافق یا کافر ہو گا تو اس سے پوچھا جائے گا: تو اس ہستی (یعنی سیدنا محمد ﷺ) کے متعلق (دنیا میں) کیا کہا کرتا تھا؟ وہ کہے گا: مجھے تو معلوم نہیں، میں وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ اس سے کہا جائے گا: نہ تو نے انہیں جاننے کی کوشش کی اور نہ ماننے کی۔ (اس غفلت اور عدم پہچان پر) اُسے لوہے کا گُرز مارا جاتا ہے تو وہ (شدت تکلیف) سے چیختا چلاتا ہے جسے سوائے جنات اور انسانوں کے قریب والی مخلوق سنتی ہے۔

جب مومن نے قبر میں سوال و جواب کے وقت توفیقِ خداوندی سے حضور نبی اکرم ﷺ کو پہچان لیا تو دراصل یہاں اس کے آپ ﷺ کو پہچاننے میں حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب انبیاء کرام کا پہچاننا شامل ہے۔ اسی نکتے کو ہم اب ایک دوسرے رخ سے دیکھتے ہیں۔ جب تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا ذکر کیا گیا تو یہ اجتماعیت کا بیان تھا لیکن جب ان میں سے ایک صاحبِ فضیلت، رسول معظم ﷺ کی طرف اشارہ کیا گیا تو یہ وحدت کا بیان ٹھہرا۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ وحدت اور اجتماعیت ہر معاملے میں باہم ایک دوسرے سے

٦۔ نسائی، السنن، کتاب الجنائز، باب المسألة في القبر، ٤:٩٧، رقم: ٢٠٥١

پیوستہ ہیں۔ فلسفہ وحدت و اجتماعیت اس امر کا متقاضی ہے کہ جب آپ اجتماعیت میں ہوتے ہیں تو اپنی وحدت کو بھولنا پڑتا ہے اور جب وحدت جلوہ گر ہوتی ہے تو پھر اجتماعیت اپنے وجود سے خالی ہو جاتی ہے۔ یہی وحدت و اجتماعیت ہم نماز میں پاتے ہیں، نماز کو جماعت کی شکل میں ادا کرنے کا حکم ہے یہ اجتماعیت ہے جس میں امیر وفقیر، شاہ وگدا، خادم ومخدوم، چھوٹا بڑا، سرخ وسفید، کالا و گورا سب ایک ہی صف میں اللہ کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں لیکن امام صرف ایک ہی ہوتا ہے ، یہ وحدت کی ایک شکل ہے۔ اسی وحدت کا تصور اجتماعیت میں یوں نمودار ہوتا ہے کہ سب نمازی ایک واحد و یکتا معبود کے حضور سراپا تسلیم و رضا بن کر اس کے دھیان میں فنا ہو جاتے ہیں۔

۹۔ انقلابی تحریکی زندگی اور فلسفہ وحدت و اجتماعیت

تمام کارکنان، اراکین اور رفقاء و وابستگان اس امر کو ذہن نشین کر لیں کہ ان کی تحریک میں شمولیت امام کے پیچھے نماز میں شامل مقتدیوں کی مانند ہے۔ جب امام کی امامت میں نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں تو ہم جماعت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس طرح جب ایک قائد کی رہنمائی میں انقلابی تحریک میں شامل ہو کر انقلاب کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں تو اب اس تحریک سے علیحدگی کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ جب ہم نے کہا کہ وحدت میں حیات ہے اور اجتماعیت میں بقا ہے تو دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ہم اپنی جماعت کی بقا چاہتے ہیں تو ہر صورت وحدت سے جڑے رہیں۔ وحدت سے ٹوٹنے کے نقصانات کے بارے میں حکیم الامت کچھ یوں تحریر کرتے ہیں:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اگر دورانِ نماز صف ٹوٹ جائے تو امام کتنا ہی قوی اور قابل کیوں نہ ہو جماعت برقرار نہیں رہتی۔ اس لیے اجتماعیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وحدتِ فکر برقرار رہے۔ حالتِ نماز میں اگر یہ وحدتِ فکر برقرار نہ رہے اور ہر مقتدی اپنی ذات کے حصار میں گرفتار ہو کر خود کو سیٹھ، چوہدری، حاکم اور آقا سمجھتا رہے تو پھر اس طرح تو ہم نے روحِ نماز کو فراموش کر دیا۔ اس لیے لازم تھا کہ جب جماعت میں کھڑے ہو گئے تو پھر محمود و ایاز کی شناخت کئے بغیر جماعت ہی ہماری شناخت ہے ہم اپنا وجود اور اپنی شناخت جماعت میں فنا کر چکے ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال ایسی ہی جماعت کی تو بات کرتے ہیں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

حکیم الامت شاعرِ مشرق اسی کیفیت کو مزید بیان فرماتے ہیں:

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہم جب تک تحریک میں شامل نہ ہوئے تھے تو ہم میں کوئی رانا تھا، کوئی چودھری تھا، کوئی میاں تھا، کوئی خان تھا، کوئی وٹو تھا وغیرہ۔ اس وقت تک ذات پات کی شناخت تھی لیکن جب ہم تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور مصطفوی انقلاب کے سپاہی بن گئے تو اب ہماری اپنی شناخت ختم ہوگئی اور سب یک جان ہو کر ایک ہی مشن کی تکمیل اور مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئے۔ تحریک کے مشن کے حق ہونے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہر

کارکن کو تحریک کی اجتماعیت میں گم ہو کر اپنی رائے سے دستبردار ہونا ہی شرطِ اول ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم یا پھر سنگ ہو جا

جب ایک مشن کے حصول کی خاطر خود کو بیچ دیا تو پھر 'میں' اور 'تو' کی قید سے نکل گئے۔ یہ ایسا سودا ہے جس کی تجارت میں کوئی خسارہ نہیں بلکہ ہر طرف نفع ہی نفع ہے۔ بقول شاعر:

جب تک بکے نہ تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تو نے خرید کر انمول کر دیا

چنانچہ غلبہ حق اور اِحیاء دین کے لئے جدوجہد میں حائل مصلحتوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے حق کے چراغ کو جبر و استبداد کی تند و تیز آندھیوں میں بھی بجھنے نہ دینا ہی مقصدِ حیات ہونا چاہیے۔ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر تحریکی جد و جہد میں صاحب عزیمت بن کر ہر باطل سے ٹکڑا جانا ہی ہماری شناخت ہے۔

اس باب کے آغاز میں ہم نے انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ المومنون کے حوالے سے کیا تھا۔ آخر میں اُسی کو ایک اور انداز میں دہرائیں گے تاکہ بات مزید واضح ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ (1)

اور بے شک ہم نے انسان کی تخلیق (کی ابتداء) مٹی (کے کیمیائی اجزاء) کے خلاصہ سے فرمائی ○

پھر فرمایا:

---

(۱) المومنون، ۲۳:۱۲

ثُمَّ جَعَلْنٰـهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍo[1]

پھر اسے نطفہ (تولیدی قطرہ) بنا کر ایک مضبوط جگہ (رحم مادر) میں رکھاo

مزید فرمایا:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰـمَ لَحْمًاق ثُمَّ اَنْشَاْنٰـهُ خَلْقًا اٰخَرَط فَتَبٰـرَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَo[2]

پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلّق وجود بنا دیا، پھر ہم نے اس معلّق وجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے، پھر ہم نے اس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت (اور پٹھے) چڑھائے، پھر ہم نے اسے تخلیق کی دوسری صورت میں (بدل کر تدریجاً) نشوونما دی، پھر (اس) اللہ نے (اسے) بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہےo

یہ سارا عمل اللہ رب العزت کی سنت ہے، لیکن اب خالقِ دو جہاں ہمیں انسان کہہ کر مخاطب فرماتا ہے۔ ہمیں **نُطْفَة**، **عَلَقَة**، **مُضْغَة** یا **عِظْم** نہیں کہتا، حالانکہ یہ سب انسان ہی کی مختلف حالتیں ہیں۔ اگر اس سنت الٰہیہ پر ہم اپنی تحریکی زندگی کو منطبق کریں تو وہ یوں ہے کہ تحریک کے آنے سے پہلے ہم رانا، ملک، راجہ، چودھری اور سیٹھ جو کچھ بھی تھے، سو تھے، مگر تحریکی زندگی میں ہماری ہر قسم کی انفرادی شناخت اجتماعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یاد رہے کہ انفرادی شناخت محض تعارف کی حد تک تھی۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے خود وضاحت فرمائی ہے:

يٰٓـاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰـكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰـكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَـآئِلَ

---

(۱) المومنون، ۲۳:۱۳

(۲) المومنون، ۲۳:۱۴

لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌo [(۱)]

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا فرمایا اور ہم نے تمہیں (بڑی بڑی) قوموں اور قبیلوں میں (تقسیم) کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو، بے شک اللہ خوب جاننے والا خوب خبر رکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و تکریم کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ ہم نے دنیا میں ذات پاک کو عزت و ذلت کا جو معیار اور تفریق بنا رکھی ہے قرآن حکیم نے اسے یکسر مسترد کر دیا ہے۔

تحریکی زندگی میں ہر قسم کی انفرادی شناخت بے معنی ہوتی ہے۔ جب تحریک میں شامل ہو گئے تو اب ہماری شناخت صرف تحریک کے کارکن کی ہے۔ باقی سب شناختیں اسی ایک پہچان میں گم ہوگئی ہیں۔ قومی سطح پر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے الا ماشاء اللہ اس ذاتی تعارف کو اپنی ذات پر اس قدر چسپاں کر دیا ہے کہ ہم خود کو رانا، ملک، راجہ، راجپوت، میاں، بٹ اور چودھری کہلائے بغیر مکمل نہیں سمجھتے۔ جب ہم نے تحریک میں شمولیت اختیار کر لی ہے تو اب اس کی اجتماعیت میں داخل ہو کر اپنی انفرادی سوچ کو قائد کی سوچ میں فنا کرنا ہوگا اور اپنے وجود کو تحریک کے وجود میں گم کرنا ہوگا۔ اس کی ایک روزمرہ آسان مثال ایک مشہور پکوان دلیم کی تیاری سے دی جا سکتی ہے۔ یہ پکوان مختلف اجناس یعنی دالوں وغیرہ کا مرکب ہوتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرتے چلیں کہ ہمارے ہاں یہ 'حلیم' کے نام سے غلط العام کے طور پر مشہور ہوگیا ہے حالاں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اِسم صفاتی ہے جس کا معنی ہے: بردبار، حِلم والا۔ جب کہ مذکورہ پکوان کو اَصل میں دلیم یا لحیم کہا جاتا تھا۔ یہ پکوان اُس وقت تک تیار نہیں ہوسکتا جب تک اس میں شامل تمام اجزاء آپس میں گھل مل کر یک جان نہیں ہو جاتے۔

تحریک منہاج القرآن بھی ایک حقیقی پکوان کی مانند ہے۔ جب تک تحریک میں شامل

---

(۱) الحجرات، ۴۹:۱۳

نہ ہوئے تھے آپ میاں بھی تھے، چوہدری بھی تھے، شیخ بھی تھے، کوئی تکبر میں گرفتار تھا تو کوئی رعونت وغرور کا شکار، لیکن جب تحریک کی دیگ میں شامل ہوئے تو منہاج کی حلیمیت کے زیر اثر اللہ رب العزت کے حضور عجز و نیاز کا پیکر بن کر ذاتی شناختوں کے حصار سے نکل کر یک جاں ہو گئے۔

الغرض یہ فنائیت آپ کو ایسی تمام مصنوعات میں نظر آئے گی جہاں مختلف اجزائے ترکیبی استعمال ہوتے ہیں۔ خصوصاً آپ سیمنٹ کی تیاری پر غور کریں۔ اس میں بنیادی طور پر جپسم اور لائم سٹون شامل کیے جاتے ہیں۔ جب تک وہ اپنی انفرادیت فنا ہو کر یک جان نہیں ہو جاتے تب تک وہ سیمنٹ نہیں کہلائیں گے۔

تحریکی زندگی میں فنائیت کی ایک اور شکل ایک عظیم مقصد کے لئے خود کو بے نام کرنا بھی ہے۔ جیسے سورج کی موجودگی میں چاند، ستارے نظر نہیں آتے، حالانکہ وہ موجود ہوتے ہیں اسی طرح اپنے طور پر مختلف عہدے دار خواہ کتنی بھی شہرت و اہمیت رکھتے ہوں، جب اپنے قائد کے سامنے آتے ہیں تو اپنی انفرادیت معدوم پاتے ہیں۔ ادب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قائد کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر کے اپنی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔

۱۰۔ فنائیتِ ذات کا بیان: قرآن حکیم کی روشنی میں

اسی موضوع سے متعلق ایک اور مثال قرآن حکیم سے پیش کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰی وَلٰـکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ط قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْئًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ o (۱)

(۱) البقرہ، ۲:۲۶۰

اور (وہ واقعہ بھی یاد کریں) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا: میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تُو مُردوں کو کس طرح زندہ فرماتا ہے؟ ارشاد ہوا: کیا تم یقین نہیں رکھتے؟ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں (یقین رکھتا ہوں) لیکن (چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو بھی خوب سکون نصیب ہو جائے، ارشاد فرمایا: سو تم چار پرندے پکڑ لو پھر انہیں اپنی طرف مانوس کر لو پھر (انہیں ذبح کر کے) ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر انہیں بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے، اور جان لو کہ یقیناً اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہےo

جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وقت کے محبوب نبی اور داعی تھے۔ وہ امت مسلمہ کو ایک قائد کی حیثیت سے پیغام بھی دے رہے ہیں۔ انہوں نے اللہ رب العزت سے سوال کیا: مولا! مجھے دکھا کہ تو مردہ کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ اس میں سے دو معانی نکلتے ہیں؛ ایک ظاہری کہ جب لوگ مردہ ہو جاتے تو ان کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ دوسرا باطنی کہ جب لوگوں کے دل مردہ ہو جائیں تو انہیں کیسے زندہ کرتا ہے؟

اللہ رب العزت کی جانب سے حکم ہوا: اے ابراہیم! چار پرندے لے لو۔ حضرت ابراہیم نے ایک مرغ، ایک کبوتر، ایک مور اور ایک کوا لیا۔ یہ چاروں پرندے معنوی طور پر چار مختلف اوصاف کے حامل تصور کیے جاتے ہیں۔ مرغ شہوت کا نمائندہ، کوا نجاست کی علامت، کبوتر بے حمیتی اور مور تکبر و تفاخر کا پیکر ہے۔ ان میں سے ہر پرندے کی خصلت دوسرے سے جدا ہے۔

اللہ رب العزت فرمایا: اے ابراہیم! ان پرندوں کو خود سے مانوس کر لو۔ یعنی انہیں اپنی صحبت میں بٹھا کر ان سے صفاتِ رذیلہ کو ختم کر کے اپنی قربت کی صفات کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیں تاکہ ان کی انفرادیت ختم ہو جائے اور آپ کی اجتماعیت میں کاملاً فنا ہو جائیں۔ یہاں استعارۃً کارکنوں کی تربیت کی طرف اشارہ ہے۔ انہیں رشد و ہدایت اور انقلاب کی فکر دیں تاکہ ان کے دلوں میں آپ کی محبت کامل ہو جائے اور تحریک کے مشن کی خاطر جان تک کی

پروا نہ کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ کام مکمل کرلیا تو پھر ارشاد فرمایا:

اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْئًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا. [1]

(انہیں ذبح کر کے) ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر انہیں بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔

اب دیکھنے میں وہ سب ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں فنا ہوکر بقا پا چکے تھے، اس لئے بلانے پر بھاگے چلے آئے۔

آج! اگر ہم اپنی زندگیاں بدلنا چاہتے ہیں اور انقلاب کا عزم لے کر چلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی ذات کو اجتماعیت میں فنا کرنا ہوگا، عبادت کی روح پھونکنا ہوگی، عوام کے مردہ دلوں کو پھر سے توحید و رسالت کے نور سے منور کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے کردار کو صحابہ کرام علیہم الرضوان اور اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کے فیض اور اولیاء کرام کے وسیلے سے ایسا بنانا ہوگا کہ مشن کی پکار پر ہر طرح کے خوف و طمع سے بے نیاز ہوکر لبیک کہتے ہوئے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پکارنے پر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے باوجود چاروں پرندے ان کی طرف دوڑے چلے آئے تھے۔ ہمیں اس عظیم کامیابی کے حصول کے لئے متحد اور مجتمع ہونا پڑے گا اور اپنی ذات کو بھلا کر ایک وحدت میں زندہ رہنا ہوگا۔

---

(۱) البقرة، ۲:۲٦۰

باب نمبر 2

تحریکی زندگی میں نظم و ضبط

﴿ایک قرآنی تمثیل﴾

گزشتہ باب کا اختتام ہم نے فنائیتِ ذات اور کارکنوں کی تربیت کے حوالے سے کیا تھا۔ اس باب کا آغاز بھی کارکنوں میں نظم و ضبط کے حوالے سے ہم قرآنِ مجید کی آیتِ مبارکہ ہی سے کریں گے۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی سولہویں سورت کا نام **اَلنَّحل** رکھا ہے۔ عربی زبان میں **اَلنَّحل** شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ اگر ہم شہد کی مکھی کی زندگی اور اس کی مسلسل جد و جہد کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خالقِ کائنات نے اِس مخلوق کو اپنی وحدانیت اور قدرت کے کمالات و اوصاف پر ایک دلیل بنایا ہے۔

اللہ رب العزت کا شہد کی مکھی کو اتنی اَہمیت دینے اور اس کے عنوان سے قرآن حکیم میں ایک پوری سورت کو مزین کرنے کے پس پردہ حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس مخلوق کو ایک ایسا منہج ودیعت کیا ہے جو انسانی زندگی کے بہت قریب ہے۔ جس طرح انسان پورے عالم میں اللہ کی عجیب ترین مخلوق نظر آتا ہے اُسی طرح عالمِ حیوانات میں شہد کی مکھی اللہ کی عجیب ترین مخلوق نظر آتی ہے۔ انسان کے بعد شہد کی مکھی وہ واحد مخلوق ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنی وحی کا شرف عطا کرتے ہوئے خود مخاطب فرمایا ہے:

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ.[1]

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں (خیال) ڈال دیا۔

وحی سے مراد الہام بھی لیا جاتا ہے یعنی اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کو اُس کا نظامِ حیات اِلقاء کیا۔ اس سے مراد وہ programmed system اور اُلوہی و اِلہامی نظام ہے جو اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔

---

(۱) النحل، ۱۶:۶۸

ا۔ شہد کی مکھی اور انسان میں بنیادی فرق

شہد کی مکھی کے نظامِ حیات کا ایک نہج سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِسے اِنسان کی تربیت کے لئے منہج بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو وحی کرنے کے لیے جس بشر کو چنا اسے نبی بنایا یعنی ہر انسان پر وحی نہیں نازل فرمائی کی بلکہ صرف اپنے انبیاء و رسل کو اس کا حق دار ٹھہرایا۔ جب آپ عالم حیوانات میں شہد کی مکھی کو دیکھتے ہیں تو اللہ رب العزت نے اس کی پوری نسل کو وحی کی ہے، جو الہام پہلی مکھی کو اِلقاء کیا گیا تھا، آج بھی تمام مکھیوں کے لیے وہی پیغام ہے۔ آج بھی شہد کی مکھی لاکھوں سال پہلے دیے گئے الوہی حکم پر اُسی طرح سے عمل پیرا ہے۔ اس کے برعکس انسان جسے خدا نے اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کہہ کر زمین پر بھیجا؛ کیا وہ بھی اپنے وعدے پر اسی طرح سے کاربند ہے؟

حضرت انسان میں حکم اِلٰہی کی اِطاعت قدرِ مشترک کے طور پر نظر نہیں آتی۔ انسان اپنے نظام اور منہج کو بھول گیا، اسے اپنے خالق کی عطا کردہ ہدایت یاد نہ رہی اور وہ اپنے منہاجِ حیات سے دور ہوتا چلا گیا۔ شہد کی مکھی اپنے پیٹ سے انسانیت کی شفا اور بقا کے لیے جو شہد دیا کرتی تھی آج بھی اسی طرح سے دے رہی ہے، مگر انسان کبھی ہدایت کا پیکر اور کبھی سراپائے سرکشی بن جاتا ہے۔ وہ کبھی امن کے لئے سرگرداں ہوتا ہے تو کبھی فساد انگیزی پر اُتر آتا ہے۔ کبھی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے نظام دیتا ہے تو کبھی وہ سارے نظام کو خود ہی الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر حضرت انسان اللہ تبارک و تعالیٰ سے کیے ہوئے اپنے عہد سے منحرف ہی رہا ہے اور اس نے اپنے وعدے کا پاس بھی نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس شہد کی مکھی ہے کہ رب العزت نے جس کام کے لیے چن لیا وہ پوری تن دہی سے اطاعت کی پیکر بنے اسی پر کاربند ہے۔

۲۔ شہد کی مکھی کا منہجِ حیات

شہد کی مکھی کے منہجِ حیات کی تفصیل سورۃ النحل کی آیات نمبر ۶۸ اور ۶۹ میں یوں بیان

ہوئی ہے:

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ○ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکَ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِہَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ○

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں (خیال) ڈال دیا کہ تو بعض پہاڑوں میں اپنے گھر بنا اور بعض درختوں میں اور بعض چھپروں میں (بھی) جنہیں لوگ (چھت کی طرح) اونچا بناتے ہیں○ پس تو ہر قسم کے پھلوں سے رس چوسا کر، پھر اپنے رب کے (سمجھائے ہوئے) راستوں پر (جو اُن پھلوں اور پھولوں تک جاتے ہیں جن سے تو نے رس چوسنا ہے، دوسری مکھیوں کے لیے بھی) آسانی فراہم کرتے ہوئے چلا کر، ان کے شکموں سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے (وہ شہد ہے) جس کے رنگ جداگانہ ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانی ہے○

اِن آیاتِ مبارکہ سے شہد کی مکھی کی وُسعتِ عمل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے اِس معمولی سی جان کو عالم جمادات و نباتات، عالم انس و جن اور عالم حیوانات میں سے ایک خاص الہام کے لئے منتخب فرمایا۔ دوسری بات اللہ رب العزت نے صیغہ تانیث میں بات کی ہے۔ آیت مبارکہ کے لفظ اِتَّخِذِیۡ میں کسی مذکر کو نہیں بلکہ مؤنث کو مخاطب کیا ہے۔ اِس سے یہ بھی پتہ چلا کہ جسے الہام کیا جا رہا ہے وہ مذکر نہیں بلکہ مؤنث ہے کیوں کہ اِس نوع میں مؤنث زیادہ خدمات سرانجام دیتی ہیں۔

شہد کی مکھی کے اندر ایک نظام بلکہ ایک کائنات ہے۔ اس کے گھر کا ڈیزائن مسدس شکل کا ہوتا ہے۔ ایک انجینئر ہی جان سکتا ہے کہ مربع شکل کی مضبوطی اور مسدس شکل کی مضبوطی میں کیا فرق ہے؟ مسدس شکل کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تعداد میں اس میں سما سکتی ہیں۔

اس کی دیواریں مضبوط ہوتی ہیں اور دشمن انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پھر اس شکل میں جو حسن و خوب صورتی ہوتی ہے وہ رباعی شکل میں نہیں ہوتی۔

جدید سائنسی تحقیق کے مطابق شہد کی مکھی کے چھتے میں ایک وقت میں چار سے آٹھ ہزار کارکن رہتے ہیں۔ ان تمام کارکنان کی سوچ بھی ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سوچ میں وحدت رکھتے ہوئے کارکنوں میں اتباع اور اطاعت کا ایک جذبہ رکھ دیا ہے۔ وہ سب کی سب اپنی ملکہ کی اِطاعت و اِتباع میں اس کی رعایا بن کر رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو جو نظام ودیعت کیا ہے، اس سے سرِ مُو اِنحراف ممکن نہیں۔ مکھی جونہی پیدا ہوتی ہے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتی ہے۔ اسے اوائل عمری ہی سے جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس پر مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔ اندازہ کیجیے کہ جسے پیدائش ہی سے اِطاعت کی تعلیم دی جائے تو اُس مخلوق کا مقام و مرتبہ بھلا کیا ہوگا؟

۳۔ شہد کی مکھی کی منزلِ یقین اور فرض شناسی

اِنسان اور شہد کی مکھی میں چند اُمور مختلف ہیں۔ اِنسان کا بچہ پیدائش کے بعد تین، چار سال بعد درست انداز سے بولنا سیکھتا ہے۔ وہ درجہ بہ درجہ احسانات، شعور اور مشاہدے کے ذریعے علم الیقین اور عین الیقین کے مراحل سے گزرتا ہوا حق الیقین تک آتا ہے۔ جب کہ مکھی پیدا ہوتے ہی حق الیقین کے مقام پر فائز ہو جاتی ہے۔ وہ جنم لیتے ہی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے مقامِ کار سے پاکیزہ پھلوں اور پھولوں سے رَس چوس کر لاتی ہے اور شہد جیسی مقدس سوغات میں منتقل کر دیتی ہے۔

شہد کی ہر مکھی کا ایک مقصد حیات ہے اور وہ ساری زندگی اسی پر سختی سے کاربند رہتی ہے۔ نوعمری ہی سے جو وظیفہ انہیں دیا جاتا ہے وہ اسی پر گام زَن رہتی ہیں۔ وہ اپنے مقصد سے اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتی ہیں۔ جب تک انہیں نتیجہ حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھتیں۔ گویا جہدِ مسلسل ان کی فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔

۴۔ محبت و وحدت اور اِجتماعیت کا ثمر

شہد کی مکھیاں ہمیشہ ایک گروہ کی صورت میں مجتمع ہو کر رہتی ہیں۔ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور اعتراض نہیں ہوتا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جب ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کر اپنے کام میں جُت جائے تو پھر شہد پیدا ہوتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ شہد کیا ہے؟ قرآن حکیم فرماتا ہے:

شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○[1]

’’ایک پینے کی چیز ہے (وہ شہد ہے) جس کے رنگ جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانی ہے○‘‘

شہد کی مکھی کے کارخانے میں ہر ایک کارکن کی الگ الگ ذمہ داری اور کام ہوتا ہے۔ کچھ کارکن سفر کر کے ثمرات کا جوس چوس کر لاتے ہیں اور آ کر اپنے چھتے میں منتقل کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ملکہ کی اولاد کو پالتی ہیں اور کچھ مل کر خوراک مہیا کرتی ہیں۔ کچھ مکھیاں شہد اور گھر کی حفاظت پر مامور ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر کارکن کے لئے ایک وظیفہ اور کام ہے۔ ایک مکھی ایسی بھی ہوتی ہے جو امور داخلہ و خارجہ کی نگرانی کرتی ہے کہ کتنی مکھیاں باہر گئی ہیں اور کتنی واپس آئی ہیں۔ مکھیاں اپنی ملکہ (قائد، امیر و رہنما) کی اِجازت کے بغیر اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتیں۔ ان میں اتحاد کا یہ عالم ہے کہ جو کارکن یعنی مکھی اپنے چھتے یعنی گھر اور مرکز سے جدا ہو جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ یا تو کسی دوسرے چھتے میں جائے گی، وہاں ٹھہرنے کی اِجازت مانگے گی اور اگر اجازت مل گئی تو وہاں ٹھہر جائے گی، مگر جس مکھی نے چھتے سے بغاوت کی ہو گی اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ شہد کی مکھی اپنے اجتماع میں رہتی ہے تو حیات میں

(۱) النحل، ۱۶:۶۹

رہتی ہے، مرکز سے جدا ہوجائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایک کارکن کے لیے اس سے بہتر مرکز سے وابستگی کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟ گویا مرکز سے علیحدگی تحریکی موت کے مترادف ہے۔

۵۔ تنظیم سازی کا ایک نادِرنمونہ

جب ملکہ کی زیرِ نگرانی مسلسل تربیتی عمل سے گزرتے ہوئے اس کے شاگرد یعنی دیگر ملکات تیار ہوتی ہیں تو پھر وہ اپنے تربیت یافتہ کارکنوں کو دیگر مقامات پر بھیجتی ہیں تو ایک نئی ریاست کا قیام وجود میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مرکز کے نمائندہ ذیلی مراکز وجود میں آنے لگتے ہیں۔ اس طرح شہد کی مکھی کی منظّم زندگی تنظیم سازی کا ایک نادر نمونہ ہے۔

۶۔ طہارت و پاکیزگی

قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق شہد کی مکھی مندرجہ ذیل تین مقامات پر اپنے چھتے بناتی ہے:

۱۔ پہاڑ

۲۔ صحرا

۳۔ درخت

اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کی فطرت میں طہارت، لطافت اور پاکیزگی رکھ دی ہے۔ وہ پاک جگہ پر اپنا مرکز بناتی ہے۔ وہ نہ ہی کسی گندگی پر بیٹھتی ہے اور نہ ہی ناپاک شے کو پسند کرتی ہے۔

اِس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ اُس سے شہد کی صورت میں فائدہ، اِس لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ طاہر بھی ہے اور مطہر بھی۔ دوسرے لفظوں وہ خود بھی طاہر ہے اور جو طہارت اس سے نکلتی ہے وہ بھی لوگوں کے لیے باعثِ شفا ہے۔

۷۔ شفاء و منفعت

شہد کی مکھی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اگر بیمار ہوجائے تو وہ خود تو بیماری کی تکلیف اٹھاتی ہے مگر اس کا شہد کسی کو بیمار نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو ختم کر دیتی ہے مگر کسی کو ضرر نہیں پہنچاتی۔ گویا وہ زبانِ حال سے کہتی ہے کہ جب قدرت نے الہام کے ذریعے میرے اندر شفا ہی رکھی ہے تو میری زندگی کا مقصد شفا، شفا اور فقط شفا ہے۔ میں تو گم راہی سے پاک شفا کا حامل شہد مہیا کرنے پر فائز ہوں۔ شہد کی مکھی کی یہ خوبی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ مصطفوی مشن کا اَدنیٰ سے اَدنیٰ کارکن حق پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو دونوں جہانوں کی کام یابی اور خیر و برکات کے لیے سیدھے راستے کی دعوت دینے والا ہو۔

۸۔ دیانت و وفاداری

شہد کی مکھی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مشن اور مرکز کے ساتھ انتہائی وفادار اور بے لوث ہوتی ہے۔ وہ سیکڑوں میلوں کا سفر ہی کیوں نہ طے کرلے، وہ جو شہد بناتی ہے خود نہیں کھاتی۔ اس کی وفاداری کا عالم یہ ہے کہ اسے بھوک سے مرنا گوارہ ہے مگر جس ذمہ داری پر اسے مامور کیا گیا ہے، اسے بہرصورت پورا کرے گی۔

اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کو اگلا حکم یہ دیا:

فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكَ ذُلُلًا. (۱)

’’پھر اپنے رب کے (سمجھائے ہوئے) راستوں پر (جو اُن پھلوں اور پھولوں تک جاتے ہیں جن سے تو نے رس چوسنا ہے، دوسری مکھیوں کے لیے بھی) آسانی فراہم کرتے ہوئے چلا کر۔‘‘

یعنی اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ ان راستوں پر چلتی چلی جاؤ جو خدا

(۱) النحل، ۱۶:۶۸

نے تمہارے لیے مسخر کیے ہیں۔ اُس منہجِ حیات پر چلو جو تمہیں عطا کیا گیا ہے۔ پس جو کوئی حکم اِلٰہی کی اتباع میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے اُسے کامیابی کی نوید سنا دی جاتی ہے۔ جس طرح کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ سَلَکَ طَرِيْقًا يَبْتَغِي فِيْهِ عِلْمًا سَلَکَ اللهُ لَهُ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ. (1)

جو آدمی طلبِ علم میں کسی راستہ پر چلتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ جنت کے راستے پر چلا دیتا ہے۔

یعنی طالبِ خیر اور طالبِ معرفت کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

۹۔ بے مثال محنت و مشقت

اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی میں محنت، مشقت اور سخت کوشی کی صفات بھی کوٹ کوٹ کر عطا کی ہیں۔ اگر آپ عالم حیوانات میں دیکھیں تو آپ کو زیادہ تر جانور سستی و کاہلی کی علامت بنے نظر آئیں گے۔ اگر ہم شہد کی مکھی کی زندگی کا جائزہ لیں تو اس کی فطرت میں جد و جہد کا اتنا ملکہ رکھا گیا ہے کہ انسان میں بھی اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ جدید سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ ایک شہد کی مکھی کو ایک کلو شہد بنانے کے لیے چار ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔

۱۰۔ انسان اور شہد کی مکھی کا منہجِ حیات

اللہ رب العزت نے شہد کی مکھی کو جہدِ مسلسل کرنے پر اسے وہ مقام عطا کیا کہ اس

(1) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، ۵: ۴۸، رقم: ۲۶۸۲

۲۔ أبو داود، السنن، کتاب العلم، باب الحث على طلب العلم، ۳: ۳۱۷، رقم: ۳۶۴۱

۳۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱: ۸۱، رقم: ۲۲۳

کے شہد میں شفا رکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل کی آیات نمبر ٦٨ اور ٦٩ میں شہد کی مکھی کو منہج حیات دیتے ہوئے اَمر کے تین صیغے بیان فرمائے ہیں: اِتَّخِذِیْ؛ کُلِیْ اور فَاسْلُکِیْ۔ اللہ تعالیٰ نے اِن تین اَحکامات کے ذریعے حصولِ مقصد کی راہ اور کامیابی کا طریقہ سمجھا دیا ہے ۔ اس آیتِ مبارکہ کی رو سے کہ اگر کسی بھی مقصد کو حاصل کرنا ہوتو اپنے اندر یہ صفات پیدا کرو۔ اس حوالے سے شہد کی مکھی کو اِتَّخِذِیْ کے ذریعے ایک طریقہ کار دے دیا کہ یہ راستے بنا دیے ہیں، ان پر اطاعت کے ساتھ چلتی چلی جاؤ تو پھر خیر ہی خیر ملتی چلی جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا: کُلِیْ۔ اِس میں اللہ رب العزت نے اِستفادہ کا ضابطہ بیان فرما دیا کہ حلال شے کھاؤ گے تو حلال نتیجہ پیدا ہوگا۔ گویا رزقِ حلال کی طرف اشارہ کر دیا۔ طہارت اور پاکیزگی، تقویٰ واخلاص اور نیت کی صداقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اگر نیت صاف ہوگی تو نتیجہ بھی درست نکلے گا۔ فَاسْلُکِیْ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر صداقت کے ساتھ سفر کرو گے تو آخر منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

شہد کی تقریباً پچیس اقسام ہوتی ہیں۔ اسے پھلوں اور پھولوں کے ساتھ نسبت دی جاتی ہے چنانچہ جس پھل پر مکھی زیادہ بیٹھتی ہے اس کے شہد کو بھی اُسی پھل کے ساتھ نسبت ملتی ہے۔ اِسی طرح انسان اگر عرفاء کی مجلس میں بیٹھے گا تو عارف ہو جائے گا۔ اگر علمائے حق کی صحبت میں بیٹھے گا تو عالم ہو جائے گا۔ اہل صدق کی مجلس کو اختیار کرے گا تو صادق ہو جائے گا۔

۱۱۔ شہد کی مکھی بحیثیت ایک عظیم کارکن

اگر تصوف کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو سالک کے لئے سلوک اور ایک پیکر کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایسا مردِ قلندر درکار ہوتا ہے، جو اسے سلوک کے مرحلوں سے گزار کر منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے شہد کی مکھی کے لئے راستے مسخر کر دیے کہ اگر وہ ان راستوں پر چلے گی تو منزل تک پہنچ جائے گی۔ اگر وہ ادھر اُدھر نہ بھٹکے گی، صبح جائے گی اور شام کو واپس آ جائے گی۔ منہاج اس راستے کو کہتے ہیں جو خود نہیں بنتا بلکہ خدا

کے اِذن سے بنتا ہے۔ صاحب مراد اور کامل شخصیت وہ ہوتی ہے جو خود سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ رب العزت کے اذن اور امر سے ہوتی ہے۔

اس حقیقت کو اگر ہم آج کے تناظر میں دیکھیں تو بلاشبہ ہمارے لئے قیادت کے شایانِ شان اور کامل شخصیت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری ہیں۔ آپ ان کے چھتے میں چلے جائیں جسے تحریک منہاج القرآن کہتے ہیں۔ پھر تحریکِ منہاج القرآن کا ہر کارکن جو اس پر عمل کرتا چلا جائے اور اس کے نتیجے میں جو رس لائے گا امتِ بیمار کے لئے وہ شہد کی مثل باعثِ شفا ہوگا۔

شہد کی مکھی کی دوسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی اعتراض نہیں کرتی۔ قیادت کی جانب سے سے جس راستے پر چلنے کا حکم ملتا ہے تو وہ بلا چوں و چراں چل پڑتی ہے۔ جب مشن کو حق مان لیا تو فَاسْلُکِیْ یعنی اس سلوک پر چلو گے تو منزل ملے گی اور اس پر اگر نہیں چلو گے تو منزل نہیں ملے گی ۔ قابلِ غور بات ہے کہ اب آپ کو راستہ مل گیا ہے، تو آپ نے منزل کے حصول کے مشکلات کو خاطر میں نہ لائے بغیر چلتے رہنا ہے۔ اگر ایک مکھی ایک کلو شہد کے لیے چار ہزار کلومیٹر سفر کرتی ہے تو آپ اندازہ لگالیں کہ آپ کو کتنا سفر کرنا پڑے گا!

اللہ رب العزت کے ہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ عین اسی طرح مصطفوی اِنقلاب کا بھی ایک وقت معین ہے، لیکن اس کے لیے جہد مسلسل اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ اِن شاء اللہ وہ وقت ضرور آئے گا۔ بس آپ اپنے خون پسینے کی محنت اور مسلسل جد وجہد کے ساتھ مقاصد کے حصول میں سرگرداں رہیں۔ اَجر عطا کرنے والے رب کے ہاں تو کوئی کمی نہیں یہ تو ہماری قوتوں اور کوششوں پر منحصر ہے۔

۱۲۔ منہاج القرآن کا کارکن اور قائد سے تعلق

تحریک منہاج القرآن وہ پلیٹ فارم ہے جس سے حق کا راستہ دکھلایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ صرف ان راستوں پر چلنا ہے۔ اس سفر کے لیے ضروری زادِ راہ للّٰہیت، اخلاص،

تقویٰ، طہارت و عبادت اور نسبت ہے۔ یہ اوصاف جس قدر ہماری جدوجہد کا حصہ ہوں گے تو سفر بھی اتنا ہی جلدی طے ہو گا۔

منزل کے حصول تک اس زادِ راہ کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ شہد کی مکھیاں لڑتی ہیں نہ جھگڑتی ہیں وہ تو فقط اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنا اپنا وظیفہ سنبھال لیں اور جس جس ذمہ داری کی تکمیل پر قائد کی طرف سے مامور کیا گیا ہے اس کے حصول میں ذرہ برابر بھی کوتاہی اور غفلت نہ کی جائے۔

اگر قائد کی نگاہوں سے ہماری کوتاہیاں چھپ بھی جائیں تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے یہ سب کچھ کیسے چھپے گا؟ وہ پاک ذات تو ہماری رگِ جاں سے بھی قریب ہے اور وہ ہمارے دل کی کیفیات اور دماغ کے تصورات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ قائدِ انقلاب تو دنیا بھر میں بے شمار چھتے بنا چکے ہیں، جب کوئی کارکن تیار ہوجاتا ہے تو اسے مطلوبہ جگہ بھیج دیتے ہیں تاکہ اُدھر بھی اللہ تعالیٰ کے دین کی سلطنت قائم ہو اور مشن کا مرکز بن جائے۔ اگر مقصد عالم گیر مصطفوی انقلاب کا ہے تو دنیا بھر میں مشن کا پیغام پہنچانا ہے۔ تحریک کی طرف سے ہر جمعہ کو بارگاہِ رِسالت مآب ﷺ میں ہدیہ ہائے درود کی شکل میں جو شہد پیش کیا جاتا ہے، کیا آپ ﷺ اسے چکھتے نہیں ہوں گے؟

دراصل خدمت وہی مقبول ہوتی ہے جو باقاعدہ کسی منہاج سے ہو رہی ہو، ورنہ لاکھوں کروڑوں افراد ایسے ہیں جو بغیر راستے کے اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ تمہیں راستہ بھی مل گیا اور مراد بھی مل گئی۔ اس منہاج میں توحید کی تعلیم بھی مل رہی ہے اور نسبت رِسالت کی پختگی بھی میسر ہے۔ یہاں تقویٰ و طہارت، علمیّت وفکریّت کا اِستدلال و اِستنباط بھی موجود ہے۔ شہد کی مکھی کا طریقہ کار دنیا کے نظاموں سے مختلف ہے۔ آپ جیسا کھاتے ہیں ویسا ہی خارِج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شہد کی مکھی نے جو رس چوسا اسے شہد میں تبدیل کر کے دوسروں کے لیے نفع بخش بنا دیا۔ وہ اپنے اوپر تکلیف جھیل کر لوگوں کو شہد جیسی نعمت سے نوازتی ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ حقیقی کارکن وہی ہے جو راہِ حق میں پیش آنے والی تکالیف

اور مصائب کو ہمت، حوصلے اور صبر سے برداشت کرے۔ شہد کی مکھی اس قدر ناتواں اور کم زور ہو کر بھی اپنے مشن کی خاطر اتنا سفر کرتی ہے، کبھی تند و تیز ہوائیں آتی ہوں گی، طوفان آتے ہوں گے، سمندر کی طغیانیاں اسے پریشان کرتی ہوں گی، لیکن وہ تمام مسافتوں اور مراحل و مصائب سے گزر کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتی ہے۔

ہماری منزل بھی مصطفوی انقلاب ہے جس کا راستہ حضرت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے دکھایا ہے۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ مخالفتوں، مزاحمتوں، رکاوٹوں، مصائب و آلام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور طعن و تشنیع سے بے نیاز ہو کر حصولِ منزل تک سرگرم عمل رہیں۔

۱۳۔ شکرانِ نعمت پر جزا اور کفرانِ نعمت پر سزا کا اُلوہی ضابطہ

شہد کی مکھی کی جہدِ مسلسل سے تعبیر زندگی کے مطالعہ سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں، ہمیں اپنی محنت، کوشش اور تگ و دو جاری رکھنی چاہیے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے اور اُس کا شکر بجا لاتے رہنا چاہیے کیونکہ شکرِ اِلٰہی ہی درحقیقت نعمتوں میں اِضافہ کا سبب بنتا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌO[1]

’’اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہےO‘‘

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اِنکار درحقیقت اُس کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اِسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۃ النحل میں آگے چل کر ایک آیت میں مثال بیان فرمائی ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا

(۱) ابراهيم، ۱۴:۷

یَصْنَعُوْنَo[1]

اور اللہ نے ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جو (بڑے) اَمن اور اِطمینان سے (آباد) تھی اس کا رزق اس کے (مکینوں کے) پاس ہر طرف سے بڑی وسعت و فراغت کے ساتھ آتا تھا پھر اس بستی (والوں) نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا لباس پہنا دیا ان اعمال کے سبب سے جو وہ کرتے تھےo

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں اور تحدیث نعمت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُنہیں وہ مقام عطا کرتا ہے جو دوسروں کے لیے نفع رسانی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن جب وہی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو فراموش کرکے اُس کی ناشکری کا اِرتکاب کر بیٹھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس قوم پر بھوک اور خوف مسلط کر دیتا ہے اور وہ قوم طرح طرح کے آلام و مصائب کا شکار ہو کر گرداب میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

اِس آیت مبارکہ میں بیان کی گئی بستی سے مراد زمانہ ماضی کی کوئی قوم بھی ہوسکتی ہے جیسے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب یا حضرت لوط علیہم السلام کے زمانوں کے خوش حال اور آسودہ حال لوگ مراد تھے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اُنہیں دنیاوی آفتوں اور مصیبتوں نے آ گھیرا اور اُن پر قحط کی صورت میں بھوک اور پیاس مسلط کر دی گئی۔ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ اِس سے مراد کفارِ مکہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مرکزی مقام عطا کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کو جائے اَمن بنایا تھا کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اِس شہر کے بارے میں خصوصی دعا فرمائی تھی:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِناً وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَومِ الْاٰخِرِ.[2]

(۱) النحل، ۱۶:۱۱۲

(۲) البقرة، ۲:۱۲۶

اے میرے رب! اسے اَمن والا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے نواز (یعنی) ان لوگوں کو جو ان میں سے اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے۔

پھر اِسی شہر میں حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی دعا کی گئی۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اِسماعیل علیہما السلام نے عرض کیا:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ.(۱)

اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول (ﷺ) مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے (کر دانائے راز بنا دے) اور ان (کے نفوس و قلوب) کو خوب پاک صاف کر دے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اِس شہرِ مکہ میں ہر طرح کی نعمتیں عطا کی گئیں اور اسے ایک مرکزی مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اس وقت دنیا میں یہ سب سے زیادہ پُراَمن شہر تھا۔ حافظ ابن کثیر سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۱۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مکہ پُراَمن اور پُرسکون شہر تھا، اس کے ارد گرد کے لوگوں کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا لیکن اُس پُرفتن دور میں بھی اگر کوئی مکہ مکرمہ میں داخل ہو جاتا تو اُسے اَمن میسر آ جاتا اور وہ ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا۔ جیسا کہ سورۃ القصص میں فرمایا گیا ہے:

وَقَالُوۡۤا اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡهُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا ؕ اَوَلَمۡ نُمَکِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجۡبٰۤی اِلَیۡهِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○(۲)

(۱) البقرۃ، ۲:۱۲۹

(۲) القصص، ۲۸:۵۷

اور (قدر ناشناس) کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کی معیّت میں ہدایت کی پیروی کر لیں تو ہم اپنے ملک سے اُچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے انہیں (اس) اَمن والے حرم (شہرِ مکہ جو آپ ہی کا وطن ہے) میں نہیں بسایا جہاں ہماری طرف سے رزق کے طور پر (دنیا کی ہر سمت سے) ہر جنس کے پھل پہنچائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ یہ سب کچھ کس کے صدقے سے ہو رہا ہے)○[1]

یعنی اہل مکہ کی جانب ہر طرف سے رِزق کھنچا چلا آتا تھا اور یہی نکتہ سورۃ النحل کی آیت نمبر۱۱۲ میں مذکور ہے کہ اُن کے پاس ہر طرف سے رِزق بڑی وُسعت کے ساتھ آتا تھا۔ جب اہل مکہ نے ان نعمتوں کا اِنکار کیا اور سب سے بڑی نعمت جو تاجدارِ کائنات ﷺ کی صورت میں انہیں عطا ہوئی، اس کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر دو عذاب مسلط کیے:

۱۔ ایک بھوک اور پیاس

۲۔ دوسرا دشمن کے خوف کا

یعنی جو پہلو مکہ کا اِمتیازی وصف تھا۔ اُنہی دو پہلوؤں میں اہل مکہ بدترین پستی کا شکار ہوگئے۔ اُن کے پاس ہر طرف سے رزق اور پھل بکثرت آتے تھے لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کی نافرمانی کے باعث انہیں تنگ دست کر دیا گیا اور یہاں تک کہ اہل مکہ اونٹ کے خون آلود بال کھانے پر مجبور ہو گئے۔ مزید برآں ان کے ہاں اَمن بھی رُخصت ہوگیا اور خوف کے سیاہ بادل ہر وقت اَہل مکہ پر منڈلانے لگے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہمہ وقت اُن پر مسلمانوں کا رُعب و دبدبہ اور سطوت و ہیبت طاری رہتی اور حملوں کا دھڑکا لگا رہتا۔

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائے خاص کے نتیجے میں اس شہر کو ہر طرح کی نعمتوں کی فراوانی عطا کی گئی لیکن جب سب سے بڑی نعمت کا انکار کیا گیا تو اس شہر والوں سے تمام نعمتیں چھین کر انہیں محروم کر دیا گیا۔

اِسی طرح اِس آیت مبارکہ کا اِطلاق بعض مفسرین کے نزدیک مدینہ منورہ پر بھی ہوتا

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲:۵۹۰

ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی آمد کے بعد یہ شہر یثرب سے مدینہ منورہ بنا اور پھر آپ ﷺ نے اسے حرم بنایا اور اس شہر کو آپ ﷺ کا مسکن و مدفن ہونے کا اِعزاز بھی حاصل ہوا؛ لیکن جب لوگوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی اور انہیں ان نعمتوں کا اِحساس نہ رہا تو اُمت اِنتشار کا شکار ہو گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تین دن تک مسجد نبوی میں اذان نہ ہوئی،(1) لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ رہی تھی۔

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک قومیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزار رہتی ہیں، اُس وقت تک انہیں اُلوہی نعمتیں بھی ملتی رہتی ہیں لیکن جب وہ نعمتوں کا اِنکار کرتی ہیں تو ذلت و رُسوائی اُن کا مقدر کر دی جاتی ہے۔

آج اُمت مسلمہ معاشی ناہمواری اور سیاسی زبوں حالی کا شکار ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف کفرانِ نعمت ہے۔ اُمتِ مسلمہ دنیا کے ستر فیصد وسائل کی مالک ہونے کے باوجود اَغیار کی دست نگر ہے ۔ عالم یہ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے دوسروں کی سامنے ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ آج ملک خداداد پاکستان میں ہر طرف افراتفری اور بداَمنی ہے، معاشی بدحالی اور سیاسی اِنتشار کی فراوانی ہے۔ بھائی ہی دوسرے بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ چار مختلف موسموں کا حامل زرعی ملک ہونے کے باوُجود غذائی اَجناس کی قلّت کا شکار ہے۔ دنیا کا بہترین نہری نظام ہونے کے باوجود ملک میں پانی اور بجلی کی شدید قلت ہے۔ قدرتی معدنیات سے مالا مال ہونے کے باوجود معاشی خوش حالی نہیں ہے اور لوگ بنیادی ضروریات ہی سے محروم ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دین کی نعمت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم نے قرآنِ مجید جیسی عظیم نعمت پر عمل پیرا

(۱) ۱۔ دارمی، السنن، باب: (۱۵)، ما أکرم اللہ تعالی نبیہ ﷺ بعد موتہ، ۱:۵۶، رقم:۹۳

۲۔ ابو نعیم، دلائل النبوۃ:۴۹۶

۳۔ مقریزی، اِمتاع الاسماع، ۱۴:۶۱۵

۴۔ سیوطی، الخصائص الکبری، ۲:۲۸۰

ہونے کی بجائے اسے طاق میں بند کر کے چومنے، آنکھوں پر لگانے اور حلف اٹھانے کے لیے سجا دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں، لیکن ہم نے داخلی اِفتراق و اِنتشار کے باعث ان نعمتوں کو ضائع کر دیا ہے۔ تمام نعمتوں کی فراوانی ہونے کے باوجود ہم ذلت کی گھاٹی میں اترتے چلے جارہے ہیں۔

لہٰذا آج اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر ان نعمتوں کے ساتھ جڑ جانے اور اپنا جینا مرنا صرف اور صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی رضا پر وقف کر دینے ہی سے ہم اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ حکم دیا گیا۔

وَّاشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ.[1]

اور اللہ کی نعمت کا شکر بجا لاتے رہو۔

۱۴۔ مقامِ تلوین اور مقامِ تمکین

تصوف کی اِصطلاحات میں ایک مقامِ تمکین ہوتا ہے اور دوسرا مقامِ تلوین ہوتا ہے۔ تلوین میں رنگ بدلتے ہیں، جبکہ تمکین میں ایک ہی رنگ رہتا ہے۔ جب بندہ کارکن ہوتا ہے تو تلوین کی کیفیت ہوتی ہے۔ جب ایک رنگ بدلتا ہے تو دوسرا رنگ آتا ہے۔ پھر ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِرتقاع اور ارتقا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر منزل تک پہنچتے ہیں تو تَمکُّن ملتا ہے۔ امام قشیریؒ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام مقامِ تلوین پر فائز تھے اور آقا ﷺ مقامِ تمکین پر فائز تھے۔ حضور ﷺ کا مقامِ تمکین یہ ہے کہ معراج سے ویسے ہی واپس تشریف لائے جیسے وہاں گئے تھے کہ سب کچھ جذب کر لیا۔ اگر کچھ مل جائے اور اسے جذب کر لیا جائے تو اسے تمکن کہتے ہیں۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی نعمت مل جائے تو اس کو اِظہار سے چھپایا جائے۔

'نہ صلہ کی تمنا، نہ ستائش کی پروا' کے مصداق آپ مستقل مزاجی سے محنت کرتے چلے جائیں کیونکہ جن کے لیے خدمت سرانجام دے رہے ہیں، ان کی نگاہوں سے تو کچھ مخفی نہیں۔

(۱) النحل، ۱۶: ۱۱۴

اگر کوئی کہے کہ ہم محنت کر کر کے کھپ گئے ہیں، لیکن ہمیں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے ہم مستحق تھے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، البتہ اگر یہ عقیدہ اپنا لیا کہ کاش یہ ٹوٹی پھوٹی کوشش اُس بارگاہ میں قبول ہوجائے تو آپ کو سب کچھ مل جائے گا۔

ہماری منزل اور ہمارا منہاج ہمارے سامنے ہے۔ اگر مستقل مزاجی سے تکالیف پر صبر کرتے ہوئے مشن کی خدمت کا کام جاری رکھیں گے تو کوئی قوت اور طاقت آپ کو اپنی منزل سے دور نہیں کرسکتی۔ آپ نے صلہ اور ستائش کی تمنا کیے بغیر محنت کر کے اپنے اپنے حصے کا شہد لانا ہے۔ ہماری جدوجہد کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی رضا کا حصول ہے۔

باب نمبر 3

قائد اور اُس کے اَوصاف

﴿واقعہ ذوالقرنین کی روشنی میں﴾

ایک انقلابی قائد ایسا مربی اور رہنما ہوتا ہے جو کسی حالت میں بھی اپنی قوم کی اصلاح سے دست بردار نہیں ہوتا۔ وہ قوم کو درپیش مسائل سے نہ صرف پوری طرح آگاہ ہوتا ہے بلکہ ان کے حل کے لئے اس کے پاس قوانین، قواعد وضوابط پر مشتمل ایک مکمل دستور اور طریقہ کار بھی ہوتا ہے۔ وہ ایسا نظام العمل ترتیب دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر قوم دنیا بھر میں حقیقی آزادی اور خودمختاری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فلاحی ریاست بننے کے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیتی ہے۔

بڑی بڑی عظیم شخصیات اپنے اپنے دور میں اس دنیا میں تشریف لائیں، جنہوں نے اپنے اپنے ملکوں اور قوموں کے احوال کو بدلنے کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔ ان میں سے بعض کامیاب بھی ہوئے لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ دستور یا نظام جن سے لوگوں کو متعارف کرایا تھا وہ بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ ایسی ہستیاں تعداد میں بہت کم ہوئی ہیں کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی نہ ان کی یاد کم ہوئی اور نہ ہی ان کی تعلیمات کا فیض ختم ہوا۔

حقیقی قائد اور مربی وہ ہوتا ہے کہ جس کے کردار کا نقش لوگوں کے قلوب و اذہان پر ایسا نقش ہو جائے کہ وہ دنیا چھوڑ بھی جائے تو تب بھی جس انقلابی سوچ اور جرأت سے لوگوں کو باطل کے خلاف کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا کیا تھا، وہ برقرار رہے۔ اس کردار کے پیچھے اس کی فکر، انقلابی فلسفہ، اعلی اخلاقی جرأت اور اس کا روحانی مقام و مرتبہ پنہاں ہوتا ہے، جس سے اس کے پیروکاروں کو جرأت کا پیکر بنے رہنے کی توفیق ملتی رہتی ہے۔ وہ زندگی کے جملہ پہلوؤں میں اپنے قائد کے شبانہ روز قرآن وسنت پر مبنی معمولات حیات سے سبق پا کر کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار رہتے ہیں۔ ایسی ہستیاں ہمہ پہلو صفات کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے جلال و

جمال، اپنی فکر، روحانیت، جرأتِ کردار اور اپنے باطل شکن افکار سے لوگوں کی زندگیوں کو تبدیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ لوگ ان کی صحبت اور ذکر سے تسکینِ قلب پاتے ہیں۔

زیرِ نظر سطور میں ہم سورۃ الکہف میں بیان کیے گئے واقعہ ذوالقرنین کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ قائد کون ہوتا ہے؟ وہ کن اوصاف سے متصف ہوتا ہے اور اس کی قائدانہ صلاحیتوں سے قوم کس طرح مجتمع ہوتی ہے۔

حضرت ذوالقرنین کی شخصیت بھی انہیں صفات کی حامل تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا ذکر بنی نوع انسان کے سامنے مثال بنا کر پیش کیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک انقلابی شخصیت میں قائدانہ و انتظامی صلاحتیں، ضبط و کنٹرول اور بلندیِ کردار کس درجے کا ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ تمام خوبیاں حضرت ذوالقرنین کی شخصیت میں جمع فرما دی تھیں۔

ہم حضرت ذو القرنین کے قرآن مجید میں بیان کردہ پورے واقعہ اور آپ کے تینوں اسفار کے حوالے سے مذکورہ بالا جملہ خوبیوں اور صلاحیتوں کا ذکر کریں گے۔ ان قرآنی تذکار سے یہ استنباط کریں گے کہ لیڈر شپ اور کارکن سازی میں ان سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اِس باب میں قیادت کے صرف وہی اوصاف مذکور ہیں جو واقعہ ذو القرنین سے اخذ کیے گئے ہیں۔ قیادت کے متعدد دیگر اوصاف بھی ہیں جنہیں ہم تنگیِ داماں کے پیشِ نظر یہاں درج نہیں کر رہے یا وہ واقعہ ذو القرنین سے متعلق نہیں ہیں۔

اس قرآنی واقعہ کے حوالے سے حضرت ذو القرنین کی اس جد و جہد کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ زمین میں اِقتدار کا بخشا جانا

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ.[1]

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۴

''بے شک ہم نے اسے (زمانۂ قدیم میں) زمین پر اقتدار بخشا تھا۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں حضرت ذوالقرنین ؑ کو زمین پر اقتدار بخشنے کا ذکر فرمایا ہے کہ بلاشبہ انہیں ایک عظیم لیڈر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا۔ انہیں امورِ مملکت کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا تھا۔ زمانہ قدیم میں ان کی ایک مضبوط اور طاقت ور سلطنت قائم تھی۔ دنیا میں ان کی قوت کا ڈنکا بجتا تھا وہ اللہ کے نیک و صالح بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ فاتح افواج کے سپہ سالار بھی تھے۔ اگرچہ بعض مفسرین انہیں سکندر اعظم تصور کرتے ہیں لیکن قرآنی نکتہ نظر سے کہیں بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ تاہم حضرت ذوالقرنین اس قدر اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل تھے کہ بطورعظیم حکمران، ان کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ہمیں یہاں اس امر سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ آج بھی ایسے بندے پیدا فرما سکتا ہے جو امت مرحومہ کو انقلاب آشنا کر سکیں۔ بشرطیکہ قوم سچے دل کے ساتھ ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صبر و استقامت کے ساتھ باطل کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔

۲۔ وسائل و اَسباب کا عطا کیا جانا اور لوگوں کی خبر گیری رکھنا

اللہ رب العزت نے اسی آیاتِ مبارکہ میں فرمایا:

وَاٰتَیْنٰـهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًاo[1]

اور ہم نے اس (کی سلطنت) کو تمام وسائل و اسباب سے نوازا تھاo

یہاں حضرت ذوالقرنین کو اسباب و وسائل عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور کے تقاضوں کے مطابق اس کی سلطنت ہر لحاظ سے خود کفیل اور مضبوط تھی۔ جہاں انہیں اقتدار کی نعمت عطا کی گئی تھی وہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی و بہتری کے لئے اپنے اس بندے کو وسائل و اسباب سے بھی خوب نواز رکھا تھا تاکہ مخلوقِ الٰہی کی ضرورتوں اور حاجتوں کو اللہ کی عطا کی گئی نعمتوں سے پورا کیا جائے اور اس ضمن میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۴

۳۔حضرت ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی مہمات کا بیان

ارشاد فرمایا گیا:

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝[1]

پھر وہ ایک (اور) راستے پر چل پڑا ۝

یہ آیت کریمہ حضرت ذوالقرنین کی مہمات پر روانہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ کبھی مغرب کی انتہا پر واقع آبادی کی طرف سفر کرتے ہیں اور کبھی مشرق کی انتہا پر واقع آبادی کی طرف پہنچے کا عزم کرتے ہیں۔ وہ اس دوران مختلف ممالک اور اقوام کے احوال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ اعلائے کلمۃ الحق کرنے کے ساتھ ساتھ قوموں کے احوال کو سنوارتے۔ مظلوموں، محکوموں، محتاجوں اور محروموں کی مدد کرتے ہوئے انہیں طاغوت کے سامنے سینہ سپر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لوگوں کو وحشی اقوام کے شر سے بچانے کے لیے دیوار تعمیر کرتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتے ہیں۔

۴۔مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور ضرورتِ ذوالقرنین

اُمتِ مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ حضرت ذوالقرنین اللہ کے نبی نہیں بلکہ ولی تھے۔ آپ کا ایک ولی ہوکر اس قدر تمکنت اور اقتدار کا حامل ہونا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت تھی۔ نبوت تو قیامت تک لیے ختم ہو چکی ہے لیکن ولی کے آنے پر تو کوئی پابندی نہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر اُس دور کے طاغوت یعنی یاجوج ماجوج جیسی وحشی مخلوق سے ذوالقرنین کے ذریعے مخلوق کو نجات دلا سکتے ہیں، تو یہ دور بھی مالکِ کون و مکاں کے دستِ قدرت سے باہر نہیں۔

اس وقت امت مسلمہ کی زبوں حالی سے ہر درد مند دل پریشان ہے اور نم ناک

---

(۱) الکهف، ۱۸: ۸۵

آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہے کہ اے باری تعالیٰ! اس امت مرحومہ کو زوال سے نکالنے کی سبیل پیدا فرما۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس صدائے دل دوز پر فرماتا ہے کہ میری سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک خود ان میں اپنی حالت بدلنے کا مصمم ارادہ پیدا نہ ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا ذکر کیا ہے جو حالات کے سامنے جھکنے کی بجائے ڈٹ گئے اور ان کی جرأت و جواں مردی اور بے لوث قربانیوں پر نصرتِ الٰہی نے انہیں کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرما دیا۔ قرآن مجید میں ان جرأت کے پیکر رہنماؤں اور قائدین کا بیان درحقیقت ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی سے باہر نکلنا ان کے نشان راہ پر چلے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ذوالقرنین کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الۡاَرۡضِ وَاٰتَيۡنٰهُ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ سَبَبًا۝(۱)

بے شک ہم نے اسے (زمانۂ قدیم میں) زمین پر اقتدار بخشا تھا۔ اور ہم نے اس (کی سلطنت) کو تمام وسائل و اسباب سے نوازا تھا۝

سورۃ الکہف کی اس آیت کریمہ میں تعارف کروایا جا رہا ہے کہ ذوالقرنین کون تھے؟ فرمایا: ہم نے اسے زمانۂ قدیم میں زمین پر اقتدار بخشا تھا۔ یہاں اللہ رب العزت ذوالقرنین کو دی جانے والی قوت، اہلیت، اسباب، وسائل، تمکن فی الارض اور فتوحات کی صورت میں اس کی قوت اور جرات کا اظہار فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کا یہ واقعہ کو سمجھانے کے لیے بیان کیا ہے کہ سیدنا ذوالقرنین کو جو قدرت نے صلاحیت دی تھی، انہوں نے اس کو دنیوی طاقت کے مقابلے میں سرنگوں ہونے سے بچائے رکھا۔ وہ طاغوت کے خلاف نہ بکے، نہ جھکے اور نہ ہی دنیا کے کسی مفاد کی خاطر کام کیا۔

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۴

۵۔ ظالم قوم کی طرف پہلا سفر

حضرت ذوالقرنین نے باطل کے خلاف متواتر کئی مہمات کامیابی سے سر کیں۔ اس ضمن میں ان کے پہلے سفر کا آغاز قرآنِ مجید کی اس آیتِ مبارکہ سے کرتے ہیں:

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ الشَّمۡسِ وَجَدَهَا تَغۡرُبُ فِیۡ عَیۡنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنۡدَهَا قَوۡمًا ط قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِمَّآ اَنۡ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنۡ تَتَّخِذَ فِیۡهِمۡ حُسۡنًا○(۱)

یہاں تک کہ وہ غروبِ آفتاب (کی سمت آبادی) کے آخری کنارے پر جا پہنچا وہاں اس نے سورج کے غروب کے منظر کو ایسے محسوس کیا جیسے وہ (کیچڑ کی طرح سیاہ رنگ) پانی کے گرم چشمہ میں ڈوب رہا ہو اور اس نے وہاں ایک قوم کو (آباد) پایا۔ ہم نے فرمایا: اے ذوالقرنین! (یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے) خواہ تم انہیں سزا دو یا ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو○

حضرت ذوالقرنین مغرب کی سمت چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں انہوں نے سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھا۔ اللہ رب العزت انہیں پہلے غروبِ آفتاب دکھا رہا ہے اور پھر طلوع آفتاب دکھائے گا۔ حالانکہ منطقی لحاظ سے دیکھا جائے تو پہلے مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے اور پھر مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ بظاہر مشرق کا ذکر پہلے اور مغرب کا ذکر بعد میں ہونا چاہیے تھا۔ دراصل یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ جب کسی قوم کے مسیحا کو بھیجنے کا وقت آتا ہے تو وہ مسیحا تب آتا ہے جب قوم کے عروج کا سورج غروب ہو چکا ہوتا ہے۔ جب قوموں پر زوال آتے ہیں تو پھر ظلم کی سیاہ رات چھا جاتی ہے۔ اس شبِ ظلمت میں ظالم، غاصب اور استحصالی قوتوں کے شکنجے عوام کو جکڑ کر اُن کے حقوق چھین لیتے ہیں پھر وہ لوگ غروب آفتاب کی مانند سیاہ رنگ کے پانی میں ڈوب رہے ہوتے ہیں۔

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۶

یہ آیت غروبِ آفتاب کے حوالے سے اس قوم کی زبوں حالی کو بیان کر رہی ہے، جو فسق و فجور کا شکار ہو چکی تھی۔ اس میں سرکشی اور بغاوت عام تھی۔ ان کے ہاں ہر طرف خود غرضی، لاقانونیت اور بد اخلاقی کا دور دورہ تھا۔ اس معاشرے میں انسانیت اور حمیت مفقود ہو چکی تھی اور ہر جانب ظلم وستم کا بازار گرم تھا۔ یہ وہ قوم تھی جس کا اخلاق، امانت و دیانت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ یہ سنتِ الٰہیہ ہے کہ جہاں ظلم وستم کی انتہا ہو جائے اور اخلاقی حالت تباہی کے کنارے پر پہنچ جائے تو اس کی گرفت سے قبل اتمام حجت کے طور پر ان کی اصلاح کے لئے کسی مصلح اور مسیحا کو بھیجا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی سرکشی پر حضرت ذوالقرنین کو فرمایا کہ یہ تمہاری مرضی ہے کہ انہیں سزا دو یا ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

۶۔ حق کا معیار اور قائدانہ صلاحیت

یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ حضرت ذوالقرنین اس قوم کے پاس پہنچے جو ظلم وستم اور بے راہ روی کا شکار ہو چکی تھی۔ فسق و فجور ان کا وطیرہ تھا اور وہ بربادی کے گڑھے میں گر چکی تھی۔ وہ لوگ اپنی سیاہ کرتوتوں کے باعث سزا کے مستحق ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو اختیار عطا فرمایا کہ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے چاہے تو انہیں ان کے بد اعمال کی سزا دو یا پھر ان سے اچھا سلوک کرو۔ اگر ان کا مواخذہ کرنا چاہو تو پھر ان کو کٹہرے تک پہنچا کر عذاب الٰہی کا انتظار کرو اور اگر ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو تو انہیں معاف کرتے ہوئے ان کی تربیت کا نظام وضع کرو اور ان کی کردار سازی کرو۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہیں سمجھانے اور سکھلانے والا کوئی قائد میسر نہیں تھا۔ اس مقام پر حضرت ذوالقرنین کی بات کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا:

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا○ [(۱)]

ذوالقرنین نے کہا: جو شخص (کفر وفسق کی صورت میں) ظلم کرے گا تو ہم اسے ضرور

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۷

سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا، پھر وہ اسے بہت ہی سخت عذاب دے گاo

حضرت ذوالقرنین نے سزا دینے سے پہلے ضروری خیال کیا کہ اتمام حجت کے لئے ایک نظام العمل دیا جائے تاکہ اس دستور کے بعد اگر کسی نے حکم عدولی کی تو وہ عذاب کا مستحق ہو گا۔ ذوالقرنین اپنے ایک اشارے پر اس ظالم و جابر طبقے کا مواخذہ کر کے ان کو کٹہرے تک پہنچا سکتے تھے مگر اصل حکمت تو تدبر، سیاست اور فراست میں ہے۔ اللہ رب العزت نے ذہنی صلاحیت دی ہے تو پہلے ذہن استعمال ہوگا اور اللہ کی عطا کردہ اہلیت استعمال ہوگی۔ حقیقی سیاسی صلاحیت کا حامل قائد وہ ہوتا ہے جو ڈرانے سے پہلے قوم کو جملہ خرابیوں کا ایک حل تجویز کرتا ہے اور انہیں ایک باضابطہ نظام دیتا ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر قوم کامیابی سے ہم کنار ہوسکتی ہے۔

جب حضرت ذوالقرنین کو دو اختیار دیے گئے تو انہوں نے جو کچھ قوم سے کہا اُسے قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِالْحُسْنٰیۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًاo[1]

اور جو شخص ایمان لے آئے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے بہتر جزا ہے اور ہم (بھی) اس کے لیے اپنے احکام میں آسان بات کہیں گےo

دوسرے لفظوں میں جو صاحبِ ایمان ہوگیا، امن کا پیکر بن گیا اور اپنی زندگی کو سنوار گیا۔ وہ اگر اعمالِ صالحہ بجا لائے گا تو اس کے لئے جہاں اس دنیا میں آسانیاں ہوں گی، اسے عہدے، مرتبے، عزت اور سربلندی ہوگی وہاں آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایسی لازوال نعمتیں مہیا فرمائے گا جس کا دنیا کی زندگی میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی شرط یہ ہے کہ وہ دنیا میں زہد و تقویٰ اختیار کرے اور سوز و گداز کا پیکر ہو جائے۔

(۱) الکہف، ۱۸:۸۸

اس سے معلوم ہوا کہ اصلاحِ احوال کے لئے سب کو ایک ہی چھڑی سے نہیں ہانکا جاتا بلکہ عدل اور انصاف پر مبنی نظام قائم کیا جاتا ہے۔ اگر ظالم کو انجام تک پہنچاتے ہیں تو اگر کوئی معافی مانگنے آ جائے تو پھر ابوسفیان کی طرح اسی کے گھر کو دار الامن بھی بنا دیتے ہیں۔ یہاں دراصل آقا ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ جو سلطنتِ مصطفیٰ ﷺ بنے گی وہ اللہ رب العزت کے منشا کے مطابق معاملات کو حل کرے گی اور اس سے بال برابر بھی انحراف نہیں کرے گی۔

اَہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ذوالقرنین نے اس معاشرے کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ ان پر اصلاحات کا پورا نظام نافذ کیا۔ ان کی قیادت کرتے ہوئے تربیت کے ذریعے انہیں ایک قوم بنا دیا۔ وہ منتشر معاشرہ جو سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا تھا اسے اپنی رہنمائی میں ایک منظّم قوم بنا کر صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا۔ چنانچہ حقیقی قائد وہ ہوتا ہے جو صرف مرض کو نہیں دیکھتا بلکہ مرض کی تشخیص کر کے اس کا شافی علاج بھی کرتا ہے اور شفایابی کے حصول تک اس کی مسیحائی بھی کرتا ہے۔

۷۔ بے بس قوم کی طرف سفر

حضرت ذوالقرنین کے دوسرے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ○[1]

یہاں تک کہ وہ طلوعِ آفتاب (کی سمت آبادی) کے آخری کنارے پر جا پہنچا، وہاں اس نے سورج (کے طلوع کے منظر) کو ایسے محسوس کیا (جیسے) سورج (زمین کے اس خطہ پر آباد) ایک قوم پر اُبھر رہا ہو جس کے لیے ہم نے سورج سے (بچاؤ کی خاطر) کوئی حجاب تک نہیں بنایا تھا (یعنی وہ لوگ بغیر لباس اور مکان کے غاروں میں رہتے تھے)○

(۱) الکہف، ۱۸:۹۰

حضرت ذوالقرنین مغرب کے بعد مشرق کی سمت اس آبادی میں پہنچے جہاں سورج کے طلوع ہونے کا منظر عیاں تھا۔ وہاں ایک ایسی قوم کو پایا جن کے جسموں پر لباس تک نہ تھا۔ ان کے پاس سر چھپانے کے لئے چھت تک نہ تھی۔ بے سہارا، کم زور اور لاچار لوگ جانوروں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں حضرت ذوالقرنین نے اس قوم کی تربیت کی۔ ان کے لئے لباس اور چھت کا بندوبست فرمایا اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے جوہر سکھائے اور اس قوم کی تمام ضروریات کی کفالت کا انتظام فرمایا۔

حضرت ذوالقرنین کے اس سے واقعہ ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ حقیقی قائد وہی ہوتا ہے جو کہ نہ صرف قوم کی درماندگی کے مرض کی تشخیص کرے بلکہ اس کا علاج کر کے انہیں ایک باوقار، باعزت اور باحمیت قوم میں تبدیل کرتے ہوئے اس کی تمام پریشانیوں اور رنج و آلام کو دور کرنے کے اسباب بھی پیدا فرمائے۔

اس پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

كَذٰلِكَ ط وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ○[1]

واقعہ اسی طرح ہے اور جو کچھ اس کے پاس تھا ہم نے اپنے علم سے اس کا احاطہ کرلیا ہے ○

یعنی ہم نے حضرت ذوالقرنین کو اُس قوم کے احوال کی مکمل خبر دی تھی خواہ اس کا تعلق سیاست، عدل و انصاف، جرأت و قوت یا انتظامی امور سے تھا، یہ سب کچھ ہم نے ذوالقرنین کو عطا کر دیا تھا۔ اللہ رب العزت اب قوموں کا حال بتاتے ہوئے بار بار ذوالقرنین کی جرأت اور قوت کا ذکر فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو دیکھ کر وہ گھبرا جائیں گے؟ ان کے سامنے چاہے جتنی مرضی قومیں آ جائیں اُن کے لیے مسئلہ نہیں ہوتا۔

قرآن مجید نے بڑے واضح انداز میں ان سفروں اور مہموں کو جدا جدا بیان فرمایا ہے۔

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۹۱

۸۔ بے شعور قوم کی طرف تیسرا سفر

حضرت ذوالقرنین کے بے شعور قوم کی طرف تیسرے سفر کا احوال کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا○[۱]

(مشرق میں فتوحات مکمل کرنے کے بعد) پھر وہ (ایک اور) راستہ پر چل پڑا○

حضرت ذوالقرنین نے اپنے سفر کو ختم نہیں کیا بلکہ لوگوں کے اصلاحِ احوال کی خاطر انہوں نے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو بالکل اجنبی تھی۔ اس کا ذکر قران مجید نے یوں فرمایا ہے:

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيۡنَ السَّدَّيۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا○[۲]

یہاں تک کہ وہ (ایک مقام پر) دو پہاڑوں کے درمیان جا پہنچا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک ایسی قوم کو آباد پایا جو (کسی کی) بات نہیں سمجھ سکتے تھے○

حضرت ذوالقرنین نے پہلا سفر ظالم قوم کی طرف کیا۔ انہوں نے دوسرا سفر بے بس قوم کی طرف کیا اوران کا تیسرا سفر ایسی قوم کی طرف تھا جسے کسی مسیحا کی تلاش تھی اگرچہ اس بارے میں انہیں کچھ سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ کسی دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ شاید وہ اپنے دور کے علاقے کے بدو ہوں گے مگر ان کے اندر جرأت، قوت اور حمیت تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں ایک مسیحا کی تلاش بھی تھی جو ان کی مدد کر سکے۔ جب حضرت ذوالقرنین وہاں پہنچے تو انہوں نے کہا کہ یاجوج ماجوج قوم نے فساد انگیزی کی انتہا کر دی ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے:

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۹۲

(۲) الکہف؛ ۱۸: ۹۳

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا○[۱]

انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج نے زمین میں فساد بپا کر رکھا ہے تو کیا ہم آپ کے لیے اس (شرط) پر کچھ مالِ (خراج) مقرر کردیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار بنا دیں○

حضرت ذوالقرنین کو اس قوم نے بطور مسیحا سمجھنے میں دیر نہیں کی۔ انہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہی وہ نجات دہندہ ہے جو ہمیں اس وحشی قوم سے نجات دلا سکتا ہے، چنانچہ انہوں نے عرض کی کہ آپ کچھ مال کی شرط پر ہمارے اور یاجوج ماجوج کی قوم کے درمیان دیوار بنا دیں۔

دو قومیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ان کے علاوہ مذکورہ بالا واقعہ میں تیسری قوم کی زبوں حالی بھی دیکھ لی۔ موجودہ حالات میں پاکستان میں بھی یہ تینوں طبقات نظر آتے ہیں۔ ایک مظلوم طبقہ ہے جو ظالم طبقے کے ظلم سے پسا ہوا ہے۔ دوسرا طبقہ ڈھٹائی اور بے حیائی سے تماشا دیکھ رہا ہے۔ یہ عیش وعشرت میں پڑا ہے۔ اس بے حیا طبقہ کے تن پر کوئی لباس نہیں ہے۔ نہ کلچر ہے، نہ ثقافت ہے، نہ نظام ہے۔ اسے پرواہ ہی نہیں، بس اپنی مستی میں مست ہے۔ تیسرا طبقہ بنیادی ضرورتوں سے محروم کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اسے انقلابی نظام کی ضرورت کا احساس ہے۔

یہی صورت حال اولین مسلمانوں کی بھی ہو گزری ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○[۲]

---

(۱) الكهف، ۱۸: ۹۴

(۲) الأنفال، ۸: ۲۶

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم (مکی زندگی میں عدداً) تھوڑے (یعنی اقلیّت میں) تھے ملک میں دبے ہوئے تھے (یعنی معاشی طور پر کمزور اور استحصال زدہ تھے) تم اس بات سے (بھی) خوفزدہ رہتے تھے کہ (طاقتور) لوگ تمہیں اچک لیں گے (یعنی سماجی طور پر بھی تمہیں آزادی اور تحفظ حاصل نہ تھا) پس (ہجرت مدینہ کے بعد) اس (اللہ) نے تمہیں (آزاد اور محفوظ) ٹھکانا عطا فرما دیا اور (اسلامی حکومت و اقتدار کی صورت میں) تمہیں اپنی مدد سے قوت بخش دی اور (مواخات، اموالِ غنیمت اور آزاد معیشت کے ذریعے) تمہیں پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا فرما دی تاکہ تم (اللہ کی بھرپور بندگی کے ذریعے اس کا) شکر بجا لاسکوo

یہاں مسلمانوں کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے اور زمین پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدم استحکام کا شکار تھے۔ تمہیں مدد و نصرت کرنے والے ایک طبقے کی ضرورت تھی۔ تم ڈرتے تھے کہ کہیں ظالم لٹیرے آ کر تمہیں اچک نہ لے جائیں۔ پھر ہم نے تمہیں مدینہ جیسا محفوظ ٹھکانہ عطا کر دیا اور انصارِ مدینہ جیسے ہم درد بھائی دیے۔ جنہوں نے اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر دیا تمہیں طاقت ور کر دیا اور تمہارے لئے پاکیزہ رزق کا بندوبست فرما دیا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر بجا لاسکو۔

آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کی شکل میں ایک نظام اور ایک ایسے دستور کو متعارف کرایا ہے، جس کے تحت ریاست مدینہ میں مقیم اپنے پرائے سب بلاتفریق مذہب وملت انسانی حقوق کے مستحق قرار دیے گئے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

إِنَّهُمْ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ. [1]

---

(۱) ۱۔ أبو عبید القاسم بن سلام، کتاب الأموال: ۱۲۶، ۲۶۰، رقم: ۳۲۸، ۵۱۸
۲۔ حمید بن زنجویه، کتاب الأموال، ۱: ۳۳۱، رقم: ۵۰۸
۳۔ حمید بن زنجویه، کتاب الأموال، ۲: ۴۶۶، رقم: ۷۵۰
۴۔ ابن ہشام، السیرة النبویة، ۳: ۳۲

تمام (دنیا کے دیگر) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (قومیت) ہوگی۔

یعنی یہ اُمت واحدہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ يَهُوْدَ بَنِي عَوْفٍ أُمَّةٌ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ، لِلْيَهُوْدِ دِيْنُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنُهُمْ مَوَالِيهِمْ وَأَنْفُسُهُمْ، إِلَّا مَنْ ظَلَمَ أَوْ أَثِمَ فَإِنَّهُ لَا يُوْتِغُ إِلَّا نَفْسَهُ وَأَهْلَ بَيْتِهِ. (1)

بنوعوف کے یہودی، اہلِ ایمان کے ساتھ ایک سیاسی وحدت تسلیم کیے جاتے ہیں، یہودیوں کے لیے ان کا دین اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین، موالی ہوں یا اصل، ہاں جو ظلم یا گناہ کرے گا تو وہ اپنے نفس اور اپنے اہل خانہ کے علاوہ کسی کو ہلاک نہیں کرے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: خواہ کوئی یہودی ہی کیوں نہ ہو جس نے میرے نظام کے لیے لبیک کہہ دیا اُس کے مال و دولت عزت و آبرو جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مجھ محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہوگی۔ آپ ﷺ نے ہمیں سمجھا دیا کہ اگر ایک ولی اللہ ذوالقرنین تمکن فی الارض کا اہل ہوسکتا ہے تو پھر تاجدارِ کائنات ﷺ کا لایا ہوا نظام ہر دور میں کیوں کر قابل عمل نہیں ہوسکتا! کوئی بھی اہلیت والا آ جائے تو وہ دوبارہ انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ وہ نظام بنی اسرائیل کا تھا اور یہ مکمل ضابطۂ اخلاق محمد مصطفیٰ ﷺ نے دیا ہے، جن کی نبوت قیامت تک جاری رہے گی۔

جب اس قوم نے دیکھ لیا کہ وہ مسیحا جس کی تلاش میں ہم مارے مارے پھر رہے تھے، آ گیا ہے تو کہتے ہیں کہ اے ذوالقرنین! انہوں نے ہم پر بڑا ظلم کر دیا۔ وہ ہماری فصلیں بھی کھا گئے ہیں۔ خدارا آپ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک بلند دیوار تعمیر کر دیں تاکہ ان کی دخل اندازی بند ہو سکے۔ اس کام کے عوض ہم آپ کو خراج دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔

---

(1) ١۔ أبو عبيد القاسم بن سلام، كتاب الأموال: ٢٦٣، رقم: ٥١٨

٢۔ حميد بن زنجويه، كتاب الأموال، ٢: ٤٦٩، رقم: ٧٥٠

٣۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ٣: ٣٤

اللہ تعالیٰ اس مقام پر بے غرض اور لالچ سے بے نیاز قائد کی نشانی بتاتا ہے۔ وہ ذوالقرنین کی اسی بات سے عیاں ہے۔ فرمایا:

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًاo اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ط حَتّٰى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا لا قَالَ اٰتُوْنِيْ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًاo فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًاo[1]

(ذوالقرنین نے) کہا: مجھے میرے رب نے اس بارے میں جو اختیار دیا ہے (وہ) بہتر ہے، تم اپنے زورِ بازو (یعنی محنت و مشقت) سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گاo تم مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لا دو، یہاں تک کہ جب اس نے (وہ لوہے کی دیوار پہاڑوں کی) دونوں چوٹیوں کے درمیان برابر کر دی تو کہنے لگا (اب آگ لگا کر اسے) دھونکو، یہاں تک کہ جب اس نے اس (لوہے) کو (دھونک دھونک کر) آگ بنا ڈالا تو کہنے لگا: میرے پاس لاؤ (اب) میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گاo پھر ان (یاجوج اور ماجوج) میں نہ اتنی طاقت تھی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ اتنی قدرت پا سکے کہ اس میں سوراخ کر دیںo

حضرت ذوالقرنین نے ان سے کہا کہ مجھے میرے رب نے بہت نوازا ہے، مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں۔ تم مال و زر کی بجائے اپنے زورِ بازو سے میری مدد کرو۔ مجھے تمہاری طرف سے حوصلہ مندی، محنت و مشقت اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ چاہیے کیونکہ جو قوم محنت و مشقت سے عاری ہو جائے تو ذلت و رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

ایک طرف وہ قوم ہے جو بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی اور دوسری طرف قیادت کو دیکھیں کہ ایک کند ذہن اور کم صلاحیت رکھنے والی قوم سے وہ ایک عظیم دیوار بنوا رہے ہیں۔ قیادت وہ ہوتی ہے جس کے سامنے جو بھی قوم دے دی جائے، اس سے کام لے لیں۔

(۱) الکہف، ۱۸: ۹۵۔۹۷

بشرطیکہ اس کے پاس حیا کا علم ہو، وفا کا علم ہو، دوستی ہو، ساتھ چلنے اور آگے بڑھنے کا ارادہ ہو۔ پھر انقلاب بھی آ جاتا ہے اور نظام بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ جس سے سلامتی، آسودگی، معاشی و معاشرتی اور سیاسی استحکام تہذیب وتمدن اور فلاح و بہبود کی ایسی دیوار قائم ہو جاتی ہے جس سے طاغوت ٹکڑا کر ناکام و نامراد ہو جاتا ہے۔

بظاہر جو لوگ بالکل ناسمجھ ہوں ان سے ایسے اہم کام لینا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب قوم میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ بلاشبہ قومی سطح پر اس جذبے کا کوئی دوسرا نعم البدل نہیں ہے۔ اگر ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل کے احوال حیات پر نظر دوڑائیں تو اس وقت عرب کے باسیوں کی عمومی زندگی جہالت، درندگی، خودغرضی، لاقانونیت، قتل و غارت گری جیسے بے شمار قبیح رذائل سے بھری ہوئی تھی لیکن ایک اہلیت ایسی تھی کہ جو وعدہ کرتے تھے اس پر پامردی سے ڈٹ جاتے تھے۔ وہ مر جانا تو گوارہ کرتے تھے، مگر اپنے قول سے پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چنانچہ حقیقی رہنما وہ ہوتا ہے جو باوفا اور بلند کردار لوگوں کا چناؤ کر کے انہیں اپنی تربیت سے بے مثال بنا دیتا ہے اور یہی سب کچھ حضور نبی اکرم ﷺ نے قلیل عرصے میں کر کے دکھایا۔ وہ قوم جو جہالت اور تعصب اور انتقامی جذبات پر ہی کٹ مر جاتی تھی اب وہ ساری دنیا کی امامت و قیادت کرنے لگی تھی۔ یہی کچھ حضرت ذوالقرنین نے کیا۔ چنانچہ ایسی دیوار تعمیر کر دی گئی جس پر چڑھنے کی یاجوج ماجوج میں قدرت نہ تھی۔

۹۔ ذوالقرنین کی انتظامی استعداد

اس قوم میں قیادت، نظام، بصیرت اور منشور کی کمی تھی۔ وہ فہم، شعور اور عقل سے بھی لا بلد تھے۔ اب یہاں ذوالقرنین کی حکمت اور دانائی شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ط حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا لا قَالَ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ○[1]

---

(۱) الکہف، ۱۸: ۹۶

تم مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لا دو، یہاں تک کہ جب اس نے (وہ لوہے کی دیوار پہاڑوں کی) دونوں چوٹیوں کے درمیان برابر کر دی تو کہنے لگا (اب آگ لگا کر اسے) دھونکو، یہاں تک کہ جب اس نے اس (لوہے) کو (دھونک دھونک کر) آگ بنا ڈالا تو کہنے لگا: میرے پاس لاؤ (اب) میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گاo

مفسرین نے بیان کیا کہ وہ لوہے اور تانبے کے ٹکڑوں تک کونہیں جانتے تھے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے لوہے اور تانبے کے ٹکڑوں کے حصول کے لئے پورا نظام وضع کیا۔ پوری قوم کو اس میں مہارت دی۔ آپ نے خام لوہے کی تیاری کے لئے ایک طبقے کو تیار کیا، پھر اسے باقاعدہ لوہے کی شکل دینے اور بلاک بنانے کے لیے ایک علیحدہ طبقہ تیار کیا۔ جب بلاکس رکھ دیے گئے تو لوہے میں آگ لگانے کے کا مرحلہ آیا اور پھر اس میں تانبے کو تیار کر کے ڈالا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیڈر کا کام افرادی قوت کو تیار کرکے ان کی تربیت کرنا ہے۔ ان کے لئے نظام وضع کرنا اور ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر کارکن کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق استعمال کیا جائے، تاکہ جب سب کچھ تیار ہو جائے، تو پھر اپنی صلاحیتوں پر اترائے نہیں بلکہ عرض کرے یہ سب میرے رب کی جانب سے رحمت ہے۔ عجز و انکساری کا پیکر بنے بغیر کام کا نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ واقعہ ذوالقرنین کی روشنی میں دیگر اَوصافِ قیادت

واقعہ ذوالقرنین کا مطالعہ ہمارے لئے بعض رہنما اصول متعین کرتا ہے جو ایک قائد اور رہنما کے لئے اساسی اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ رہنما وہ ہوتا ہے جو حق سے بھٹکی ہوئی بدحال قوم کو بے آسرا نہیں چھوڑتا۔ وہ اس زبوں حال قوم کے اصل مرض کی تشخیص کرتا ہے، پھر ایک ہمہ گیر جدوجہد سے اس کا علاج کر کے شفایابی تک مسلسل رہنمائی کرتا ہے۔

مقہور و مجبور قوم کی زبوں حالی اسے مسلسل بے چین و بے قرار رکھتی ہے۔ وہ لوگوں میں باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ مایوسی و ناکامی کا لفظ اس کی لغت میں نہیں ہوتا۔ وہ اِتمام حجت کے لئے ہر طبقے کو دعوت فکر دیتا ہے اور لوگوں کو ان کے اعمال کے

حوالے سے بروقت اچھے یا بُرے انجام سے آ گاہ کرتا ہے۔ اپنی جد و جہد میں اس کی نظر اللہ تبارک و تعالیٰ کے کرم پر ہوتی ہے وہ دنیوی مال و متاع کا حریص ہرگز نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت لاچار اور مجبور قوم کے لئے ایک مسیحا کی سی ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے جرأت کردار سے امید لے کر روشن افق کی خبر دیتا ہے اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے ہنر سکھاتا ہے۔

وہ ایسے نظام عمل سے متعارف کرواتا ہے کہ جس پر چلتے ہوئے منزل تک پہنچنا ان کے لئے ناممکن نہیں رہتا۔ ایسا قائد اپنے کارکنوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ان کے احوال کو بدلنے میں شب و روز کوشاں رہتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت، کردار اور فکر سے اُن کی تربیت کرتا ہے اور اس کی تربیت ہر پہلو میں فیض رسانی کا باعث ہوتی ہے۔ حقیقی لیڈر وہی ہوتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کو ہزاروں لیڈر دے جاتا ہے۔ اس کا ہر متحرک ساتھی اپنے قائد کی قائدانہ صلاحیتوں کا نمونہ بن جاتا ہے۔ ان کے قلوب و اذہان پر اپنے قائد کی صفات، توجہات اور قائدانہ صلاحیتوں کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار اور تمکن بخشا تھا۔ تمام وسائل و اسباب سے نوازا تھا جن کو انہوں نے لوگوں کی بہتری، اصلاح اور سلامتی کے لئے بے غرض استعمال کیا۔ انہوں نے ظالموں کی سرکوبی، بے بس محکوموں کی داد رسی اور بے شعور لوگوں کو فہم و بصیرت سے ہم کنار کرنے کے لئے پے در پے سفر کئے۔ یاجوج ماجوج کے فتنے سے محفوظ کرنے کے لئے بصیرت سے بے بہرہ قوم کو لوہا اور تانبا دریافت کرنے اور پھر اسے پگھلانے جیسے پیچیدہ طریقہ کار کی حکمت عملی سے روشناس کرایا۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ لیڈر ایسا نہیں ہوتا جو حکم کے دے کر گھر بیٹھ جائے، بلکہ ضروری ہے کہ انہیں اپنے ساتھ ملا کر انقلابی راہ پر چلنا سکھائے۔ باقاعدہ نظام وضع کر کے اسے چلانے کے لیے ماہرین تیار کرے اور جب انقلاب کے لئے عوامی تیاری کر کے ساتھ میدان کار زار میں اترے تو اپنا بھروسہ صرف اللہ پر رکھے اور عجز و انکساری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے۔

چنانچہ جب حضرت ذوالقرنین نے لوہے اور تانبے کو پگھلا کر یہ دیوار تعمیر کر دی تو

فرمایا:

رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ.[1]

یہ میرے رب کی جانب سے رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ولی کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ قوم کو امن و آشتی سے ہم کنار کرتا ہے۔ انہیں ایک نظام میں پرو کر ایسی مضبوط دیوار کی مانند بنا دیتا ہے جسے قیامت تک قائم رہنا ہے۔ اپنی اس جد و جہد کے نتیجے میں حاصل کی گئی کامیابی کو وہ اللہ رب العزت سے منسوب کرتا ہے جیسے حضرت ذوالقرنین نے فرمایا کہ دیوار کی تعمیر میرے رب کی جانب سے ایک رحمت ہے۔

اِس دور میں تحریک منہاج القرآن قوم کا مقدر بدلنے کے لئے انہیں خطوط پر طاغوت سے برسر پیکار ہے جس کا سبق واقعہ ذوالقرنین ہمیں دیتا ہے۔ یہ اپنے قائد شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے ان تھک جذبوں کی امین بن کر ان کی سرکردگی میں انقلاب کی راہ پر گامزن ہے۔ ہر دور کے خضر بھی ہوتے ہیں اور ذوالقرنین بھی۔ یہ دونوں رنگ تحریکِ منہاج القرآن کو قائدِ انقلاب کی شکل میں حاصل ہیں۔ ان میں وہ تمام قائدانہ صلاحتیں بدرجۂ اَتم موجود ہیں جو ایک قوم کو انقلاب سے روشناس کرانے کے لیے ایک انقلابی رہنما میں موجود ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال انقلابی رہنما کے اوصاف کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

نگہ بلند، سخن دل نواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

دیکھا جائے تو اقبال کے بتائے ہوئے تینوں قائدانہ اوصاف قائدِ انقلاب میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے ہمیں شیخ الاسلام کی ذات میں ایسی شخصیت سے نوازا ہے، جنہیں اللہ رب العزت نے اوصافِ خضر بھی عطا کیے ہیں اور حضرت ذوالقرنین کی خوبیوں سے بھی نوازا ہے۔ اب ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ قوم میں شعور بیدار کیا جائے اور انہیں کاروانِ انقلاب کا شریک بنا کر اس مملکتِ خداداد پاکستان میں مصطفوی انقلاب کا

(۱) الکہف، ۱۸: ۹۸

سورج طلوع کیا جائے۔ اگر قوم آج بھی ظالمانہ طاغوتی نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو باطل خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا اور ہر طرف حق کے جھنڈے لہرا رہے ہوں گے۔ ان شاء اللہ! ملک کا نظام بدلے گا اور یاجوج ماجوج کا یہ طاغوت سدِ سکندری میں پابند ہو کر رہے گا۔

باب نمبر 4

نظامِ تربیت اور تصورِ جواب دہی

﴿واقعہ ہُدہُد کی روشنی میں﴾

سورۃ النمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قیادت (leadership) کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے جملہ مخلوقات کو کس طرح اپنے تصرفات کے اِحاطے میں لیا ہوا تھا۔ ائمہ ومفسرین بیان کرتے ہیں کہ آپ کی قائم کردہ پارلیمنٹ کے 600 سے زائد اراکین تھے۔ آپ سلطنت کے مختلف کاموں کو سرانجام دینے میں ہر مخلوق سے کام لیا کرتے تھے۔ جب پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا تو ہر شخص کو اس کی مشاورت میں شریک کیا جاتا۔ ہد ہد اسی دربار میں پرندوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اللہ رب العزت نے اسے یہ صلاحیت دے رکھی تھی کہ زیرِ زمین پانی کے ذخائر کا پتہ تک چلا لیتا تھا۔ اس طرح وہ حضرت سلیمان کے سفر کے دوران حصولِ آب کا اہم فریضہ بھی ادا کرتا تھا۔ چنانچہ اس سورہ میں ہد ہد سے مراد وہ خاص پرندہ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنے زیرِ تربیت رکھا۔ آپ کی بارگاہ سے اس نے intelligence، administration، time management اور ادب بجالانے کے اصول وضوابط سیکھے۔ زیرِ نظر باب میں ہم نظامِ تربیت اور تصورِ جواب دہی کے متعلق ضروری آگہی واقعہ ہد ہد کی روشنی میں بیان کریں گے۔

واقعہ سلیمان علیہ السلام کے اہم نکات

اس واقعے سے ہمیں دو طرح کی تربیت مل رہی ہے:

۱۔ اللہ کے نبی ہمیں قائد بنانا سکھا رہے ہیں کہ قیادت کسے کہتے ہیں اور قیادت میں کون کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں۔

۲۔ ہد ہد ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ کسی قیادت کے ساتھ کارکن کو کیسا ہونا چاہیے۔ ایک کارکن کا فرماں بردار اور مطیع بن کر چلنا کیا ہے اور پھر مُطاع (اِطاعت کیا گیا) بن کر چلنا

کیا ہے؟

زیرِنظر سطور میں واقعہ ہدہد کی روشنی میں تربیت کی مختلف جہات اور نکات بیان کریں گے کیونکہ قران حکیم میں حقائق کا سمندر موج زن ہے۔ اب یہ غواص کی ہمت ہے کہ وہ توفیقِ الٰہی سے اس میں سے کتنے جواہر نکالتا ہے۔ یہاں پورا قصہ بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے خاص و عام پہلے ہی آ گاہ ہیں۔

ا۔ مشاہدہ

حقیقی لیڈر وہی ہوتا ہے جو باخبر ہو۔ اسے علم ہو کہ اس کے مصاحبین کون ہیں اور کیا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام جاہ و جلال، حشمت اور مقام و مرتبت کے ساتھ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی پہلا سوال ہدہد کی دربار میں غیر حاضری کا کرتے ہیں۔ یہاں سے آپ کی قیادت کی فراست، نگاہ اور نگہبانی کا اندازہ لگائیں۔ آپ اپنے درباریوں کا جائزہ لیتے ہیں ان میں جن و انس بھی تھے، حیوانات اور چرند پرند بھی تھے غرض یہ کہ آپ کے دربار میں ہر عالم کی نمائندگی ہوا کرتی تھی۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں کیا گیا:

وَتَفَقَّدَ الطَّيۡرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى الۡهُدۡهُدَ اَمۡ كَانَ مِنَ الۡغَآئِبِيۡنَ○ (١)

اور سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے: مجھے کیا ہوا ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھ پا رہا یا وہ (واقعی) غائب ہوگیا ہے○

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اُس پرندے کو وہاں سے غیر حاضر پایا۔ یہ آیت خود بتا رہی ہے کہ وہ اجازت لے کر نہیں گیا بلکہ باقاعدہ اجازت لیے بغیر غائب ہوا۔ تَفَقَّدَ، فقدان سے ہے یعنی اُسے غیر حاضر پایا۔

ہدہد آپ کی پارلیمنٹ کا ایک رکن تھا۔ وہ مشاورت کے عمل میں شریک ہوا کرتا تھا۔

---

(١) النمل، ٢٧: ٢٠

اگر کوئی عام بندہ ہوتا تو اس پر نگاہ بھی نہ پڑتی۔ نگاہِ انتخاب ہمیشہ خواص پر پڑتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال ہی یہ پوچھا کہ ہدہد کہاں ہے؟ قیادت کی فراست اُس کی حاضر دماغی ہوتی ہے کہ وہ ہر شے پر نظر رکھتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ہدہد مجھ سے اجازت لیے بغیر کہیں چلا گیا ہے تو آپ نے اس کی گرفت کرتے ہوئے کہا کہ وہ میری اجازت کے بغیر کیسے غائب ہوگیا؟

یہاں پر مفسرین لکھتے ہیں کہ هُدْهُدًا بھی نہیں فرمایا اور هُداهُد بھی نہیں فرمایا۔ نہ جمع کا صیغہ، نہ اُس کو نکرہ کہا بلکہ الْهُدْهُدَ کہا کہ وہ خاص ہدہد جو میرے دربار میں درباری کا مقام رکھتا ہے وہ کدھر ہے؟ ہدہد تو سیکڑوں ہوں گے اُن میں سے نظرِ انتخاب تو ایک بنا۔ اُس میں اتنی خوبیاں تو ہوں گی کہ اسے اس دربار کا اہم رکن بنایا اور اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے نظم و ضبط کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔

۲۔ ترغیب و ترہیب

ہدہد نے غلطی یہ کی کہ اُس نے آپ سے اجازت نہیں لی۔ اگر اس نے کسی کو بتایا ہوتا تو اسی وقت معلوم ہوجاتا کہ وہ بتا کر یا پوچھ کر گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔ اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍo (۱)

میں اسے (بغیر اجازت غائب ہونے پر) ضرور سخت سزا دوں گا یا اسے ضرور ذبح کر ڈالوں گا یا وہ میرے پاس (اپنے بے قصور ہونے کی) واضح دلیل لائے گاo

عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ انتظام کار میں یہ سختی کیسی؟ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی اعلیٰ مثال آپ کے سامنے ہے۔ انہوں نے فرمایا: چونکہ مجھ سے باقاعدہ پوچھ کر نہیں گیا اس لیے میں اُسے سخت سزا دوں گا یا اسے ضرور ذبح کر ڈالوں گا۔ یعنی جدید اصلاح میں اُس کو ذبح کر دوں گا

---

(۱) النّمل، ۲۷: ۲۱

سے مراد اسے برخاست کر دوں گا۔ یا وہ میرے پاس اپنے بے قصور ہونے کی واضح دلیل لے آئے۔ یعنی اگر وہ کسی ایسے معرکے پر گیا ہے جو سلطنت کے امور کی بجا آوری میں صرف ہو رہا ہے، یا پھر کوئی ایسی خبر لے کر آئے جو ہماری سلطنت کی بہتری، عظمت اور اس کی فتح و نصرت کے لیے ہو تب شاید اُس کی بچت کی گنجائش نکل آئے۔

یہاں جواب دہی کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی جو قائد یا مربی ہوتا ہے اُس کے پاس تینوں اختیارات موجود ہوتے ہیں مگر وہ کوئی فیصلہ دوسرے کو اُس کا حقِ سماعت دیے بغیر نہیں کرتا۔ چنانچہ اتنی گنجائش (flexibility) قیادت میں ضرور ہونی چاہیے کہ وہ کارکن کو سماعت کا موقع بھی دے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں کہ آغاز عذاب سے کیا، پھر ذبح کہا، پھر تیسری بات یہ ہے کہ مشن کی خدمت میں گیا ہے تو معافی ہے۔ پھر یہ ایسے ہی تصور ہوگا جیسے مشن کے کسی کام کے لیے معلوماتی دورے (study tour) پر بھیجا جاتا ہے جس سے ادارے اور تحریک کو فائدہ ہو۔ اگر مشن کے بغیر گھر بار کا کام کر آیا ہے تو پھر معافی نہیں ہے۔ حقیقی لیڈر وہی ہے جس کی طبیعت میں وسعت ہو اور وہ اخلاق و عدل کا پیکر ہو۔

۳۔ اُمورِ نگہبانی

اس واقعہ ہدہد سے نگہبانی کا پہلو بھی پوری طرح عیاں ہے جو قرآن مجید کی اگلی آیت نمبر 22 سے اخذ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ.

پس وہ تھوڑی ہی دیر (باہر) ٹھہرا تھا۔

وہ سفر تو کر رہا تھا مگر اُس نے زیادہ دیر نہیں لگائی کیونکہ اس کو علم تھا کہ قائد کو پریشانی ہوگی۔ جب لیڈر باخبر اور معاملات کو کنٹرول کرنے والا ہو تو کارکن بھی خود کو پوری طرح حالات و معلومات سے آگاہ رکھتے ہیں تاکہ اپنے قائد کو ہر سطح سے مطمئن کر سکیں۔ ہدہد اُمورِ سلطنت کے مختلف گوشوں، اَطراف اور جہتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں وہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی سلطنت

کے اِرد گرد رعایا کی خبر گیری کر رہا تھا۔ عرب میں کسی کی بصارت و بصیرت کی مثال دینی ہو تو یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے: أبصرَ من هدهد۔ کہ فلاں شخص ہدہد سے بھی زیادہ صاحبِ بصیرت ہے۔ اُس کی آنکھ میں اتنی تیزی ہے کہ وہ ہدہد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یعنی ہدہد کی بصیرت اور بصارت کے اوپر ایک محاورہ بیان کیا جاتا ہے۔

۴۔ نقطہ نظر کی درستگی (Positivity in approach)

ائمہ کرام لکھتے ہیں کہ جب ہدہد اس کام کے لیے گیا تو کیا یہ فریضہ اسے سلیمان ﷤ نے دیا تھا یا اسے مکلّف ٹھہرایا تھا کہ تم جا کر اردگرد کی خبریں لیا کرو کہ میری سلطنت کے حق میں کیا ہے اور میری سلطنت کے خلاف کیا ہو رہا ہے۔ یہ فریضہ اپنے طور پر انجام دینا درحقیقت ہدہد کی طرف سے مشن سے کمال درجے کے اخلاص کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ بعد میں اس خبر کی بنیاد پر ہی ملکہ سبا کا سارا واقعہ مذکور ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ماتحت جو administrator یا manager ہے، اور اپنے boss تلے ادارے کے لیے کام کر رہا ہے تو صرف یہ نہیں ہوتا کہ اسے کہا جائے تو پھر ہی وہ ادارے کے مفاد کے لیے کوئی کام کرے اگر نہ بھی کہیں تو بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ ادارے کے حق میں بہتر ہے وہ خود سے معلومات لیتے رہیں کہ کام کیسے ہو رہا ہے اور نظام کیسے چل رہا ہے؟ یہ ایک جائزہ اور مشاہدہ ہے۔ اسے انگلش میں positive in approach کہتے ہیں۔ کارکن وہی ہے جو اپنے قائد کی منشا کو سمجھے۔

۵۔ کسی کام کا سپرد کرنا (Assignment)

ہدہد پہلے مکلّف نہیں ٹھہرایا گیا۔ حضرت سلیمان ﷤ نے اُسے کوئی ذمہ داری (assignment) نہیں دی۔ یعنی اس نے وہ بات نہیں کی جو ہم آج کہتے ہیں کہ ہمارے قائد نے ہمیں کہا ہی نہیں ہم کیوں جائیں؟ حالانکہ اگر کہا نہیں تو منع بھی تو نہیں کیا! اب یہاں پر سلیمان ﷤ نے اُسے منع کیا ہوتا کہ میرے پوچھے بغیر تم کہیں نہیں جا سکتے تو وہ کبھی نہ جاتا۔ اس

کا مطلب ہے کہ اسے ایک open area ضرور دے دیا۔ بلاشبہ permission کا نظام ادارے کے مفاد سے ضرور مشروط ہوتا ہے، ہدہد اُمورِ مملکت کے مفاد میں گیا تھا، اس لیے وہ جائز تھا۔ آپ نے اسے آخری انتخاب دے دیا کہ اگر کوئی ایسی خبر لائے جو مملکت کے حق میں ہو تب معاف کر دوں گا۔ اُس نے اگرچہ اجازت نہیں لی تھی، لیکن چونکہ امورِ مملکت کے مفاد میں وقت صرف کیا تھا تو اُس سے درگزر کرنے کی گنجائش نکل آئی۔ اُس نے وہاں پر جو مشاہدہ کیا وہ مختصراً (to the point) کوئی اہم نکتہ چھوڑے بغیر سارا پیش کر دیا۔ کوئی غیر ضروری بات بیان نہیں کی۔ کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کا یہ جدید ترین کامیاب اسلوب ہے تاکہ زیر بحث معاملہ ابہام کا شکار نہ ہو۔ اس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے:

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ۝(1)

پس وہ تھوڑی ہی دیر (باہر) ٹھہرا تھا کہ اس نے (حاضر ہو کر) عرض کیا: مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی ہے جس پر (شاید) آپ مطلع نہ تھے اور میں آپ کے پاس (ملکِ) سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۝

۶۔ جامع علم (Comprehensive knowledge)

اُس نے ایک خبر معلوم کی تو صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے تھوڑا سا وقت صرف کیا اور معاملے کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتے ہوئے علم کامل حاصل کیا۔ جب اُس نے جامع (comprehensive) علم حاصل کر لیا تب اُس نے واپسی کا رخ کیا۔ اب اسے تیقن حاصل تھا کہ میں ایک یقینی خبر لایا ہوں۔

یہ انتظامی امور کے حوالے سے بہت بڑا درس ہے۔ ہم چلتے پھرتے کوئی خبر سنتے ہیں اور اسی پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں اور کسی معتمد شخص سے پوچھے بغیر اپنی باتیں شروع کر دیتے

---

(۱) النمل، ۲۷:۲۲

ہیں اور چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جو جامع علم کی نفی اور انتظامی نظام کے سراسر خلاف ہے۔ اب ہدہد کی تربیت دیکھیں کہ وہ رُکا نہیں اور وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ وہ گہری سوچ بچار سے کچھ چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ تحقیق اور مخبری کرتے ہوئے اپنی معلومات کو تیقن کی حد تک لے جاتا رہا۔ جب اُسے یقین کامل ہو گیا تو تب واپس چلا آیا۔

اسے دربار میں آ کر اندازہ ہو گیا کہ اجازت کے بغیر گیا ہوں اور اگر باوثوق ذرائع سے اپنی آنکھوں سے کیا ہوا مشاہدہ پیش نہیں کروں گا تو گرفت ہو جائے گی۔ اب وہ کہتا ہے:

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُکَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍo اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِکُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌo وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللهِ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَo(۱)

مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی ہے جس پر (شاید) آپ مطلع نہ تھے اور میں آپ کے پاس (ملکِ) سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوںo میں نے (وہاں) ایک ایسی عورت کو پایا ہے جو ان (یعنی ملکِ سبا کے باشندوں) پر حکومت کرتی ہے اور اسے (ملکیت واقتدار میں) ہر ایک چیز بخشی گئی ہے اور اس کے پاس بہت بڑا تخت ہےo میں نے اسے اور اس کی قوم کو اللہ کے بجائے سورج کو سجدہ کرتے پایا ہے اور شیطان نے ان کے اعمالِ (بد) ان کے لیے خوب خوشنما بنا دیے ہیں اور انہیں (توحید کی) راہ سے روک دیا ہے سو وہ ہدایت نہیں پا رہےo

اس نے اپنے مشاہدے کی جملہ تفصیلات حضرت سلیمان علیہ السلام کو پیش کر دیں اور عرض کیا کہ اس یقینی خبر پر آپ اعتماد اور یقین کر سکتے ہیں۔ یہ ہدہد کا معاملہ تھا جب کہ ہماری قوم کا یہ المیہ اور شعار بن گیا ہے کہ ہم چلتی پھرتی خبروں کو تحقیق کے بغیر آگے منتقل کر دیتے ہیں خواہ اس خبر سے تحریک، ادارے یا مملکت کو کتنا ہی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑ جائے۔

---

(۱) النّمل، ۲۷: ۲۲-۲۴

پھر آگے حضرت سلیمان ﷺ نے لائحہ عمل تیار کیا اور ایک منصوبہ بندی بنائی۔ اُس کے بعد فرمایا: جاؤ اور میری طرف سے یہ خط انہیں دے آؤ۔

یاد رہنا چاہیے کہ تحریک کے لیے مکمل منصوبہ بندی کا انحصار قیادت تک پہنچائی گئی معلومات پر ہوتا ہے۔ جب آپ کو خبر دینے والا، آپ کا تابع دار اپنے کام کو بخوبی سرانجام دے رہا ہوتا ہے تو وہ اُس کے ہر ہر پہلو پر نگاہ ڈال رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم نے یہ بات سمجھی کہ جو ذمہ داری ہمیں سونپی گئی ہے، میں تو صرف اسی کا جائزہ لوں گا اور اس سے متعلق دیگر ضروری بنیادی معلومات کو نظرانداز کر دوں تو کبھی صحیح منصوبہ بندی نہیں ہو سکے گی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ہد ہد کو یہ بھی احساس تھا کہ میں پوچھے بغیر آیا ہوں، وقت پر جانا ہے اور اگر وہاں پر میں وقت پر واپس نہ گیا تو میری پوچھ گچھ اور مواخذہ بھی ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اسے time management کا احساس تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک short time period کے اندر احاطہ بھی کر لیا اور اُس کی خبر بھی اکٹھی کر لی اور بروقت پہنچ بھی گیا۔ یوں پیغام رسانی بھی ہوگئی، ابلاغ بھی ہوگیا اور اس کے نتیجے میں پھر منصوبہ بندی بھی طے پا گئی۔ اس سے بروقت انجام دہی کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔ وہ منصوبہ جو وقت کے تعین کے بغیر تیار کیا جائے وہ لیت و لعل کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بڑی بڑی منصوبہ بندیاں جو مناسب وقت پر طے نہ ہونے کا باعث ناکامیوں پر اختتام پذیر ہوئیں۔

۷۔ قیادت کی وسیع القلبی اور مشاورت

یہاں سے ایک چیز یہ بھی اخذ ہوئی کہ اگر آپ کے ماتحت آپ کو کسی ایسی اہمیت کی حامل معلومات سے آگاہ کریں جو آپ کے علم میں نہیں اور آپ کے مشاہدہ میں کوئی نئی چیز آ جائے تو قیادت کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ اسے قبول کرنے میں گریز نہیں کرتی۔ وہ ایسا کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتی۔ جب انتظامی پہلو پر اگر آپ کے ماتحت عملے سے کوئی نئی معلومات اور نئی منصوبہ بندی لے کر آتا ہے تو اُسے تحمل سے سننا واجب ہو جاتا ہے۔ اگر اُس میں علمی حوالے سے، معلومات کے حوالے سے، یا منصوبہ بندی کے حوالے سے کوئی نئی معلومات مل رہی

ہیں، جو سلطنت، ادارہ، تحریک کے لئے مفید ہے تو اُس کا احاطہ و ادراک کرنا اور پھر اُس کی خبر کی تصدیق کرنا، یقین کرنا اور پھر اُس پر منصوبہ بندی بنانا بھی اُس کا حصہ ہو جاتا ہے۔ کسی انسانی ضروری اور قابل ذکر اطلاع پر محض اس لیے توجہ نہ کرنا کہ یہ ایک ماتحت نے پہنچائی ہے، وسیع القلبی و مشاورت کے خلاف ہے۔

یہاں ہد ہد کی خبر سننے پر آپ نے یہ نہیں کہا کہ تمہارا کام تو زیر زمین پانی کا تلاش کرنا ہے تم مجھے یہ خبر دینے والے تم کون ہو؟ میں نبی ہوں یا تم نبی ہو؟ اب نبی کی یہ شان ہے کہ وہ وسیع القلبی کے ساتھ سماعت کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ کے ماتحتوں میں سے ممبرز ہیں، اساتذہ ہیں، طلبا ہیں اور وہ آپ سے کوئی مشاورت کرنا چاہیں، تو انہیں وسعت قلبی سے سننا چاہیے۔ درست فکر کی حامل اعلیٰ قیادت انہیں مشاورت میں شریک بھی کرتی ہے اور اتنا وقت بھی دیتی ہے۔

۸۔ قائدانہ صلاحیت

قیادت کی خوبی یہ ہے جہاں گرفت کرنی ہو تو وہ گرفت کرنے سے پہلے تصدیق کرتی ہے۔ جہاں پوچھنا ہو اور جن معلومات پر چلنا اس کی تصدیق کرتی ہے جب اس پر کمال درجے کا تیقن ہو جائے تو پھر اُس پر عمل کرتے ہوئے strategies بنائیں۔ ہدہد نے ملکہ بلقیس کی سلطنت کے بارے میں اہم معلومات بتاتے ہوئے بطور خاص اس کے بڑے تخت کا ذکر کیا، اس سے دراصل ہدہد کے پیش نظر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی سلطنت کی معاشی اور عسکری طاقت کو بیان کرنا مقصود تھا تا کہ ان امور کو پیش نظر رکھ کر پوری مشاوت سے فیصلہ کیا جا سکے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک غیر مسلم حکمران پر نبوی تصرف ظاہر کرنے کے لئے ایک حکمت عملی ترتیب دی۔ چنانچہ یہ حکمت عملی بناتے وقت سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنے مشیروں سے پوچھا کہ کون ہے جو ملکہ سبا کا تخت اس کے آنے سے پہلے یہاں لے آئے؟ قابلِ غور نکتہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یہ مشاورت کر رہے ہیں۔ یہ انتظامی لوازمات ہیں۔ اگر کوئی مشاورت کرتا ہے تو اس سے قیادت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ آپ فرماتے ہیں کہ کون ہے جو اس تخت کو

جلد میرے سامنے لا سکے؟ ایک قوی ہیکل جن نے کہا:

اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ ۚ وَاِنِّیۡ عَلَیۡهِ لَقَوِیٌّ اَمِیۡنٌ ○[1]

میں اسے آپ کے پاس لاسکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں اور بے شک میں اس (کے لانے) پر طاقتور (اور) امانت دار ہوں ○

آپ نے فرمایا: نہیں۔ پھر وہاں پر آصف بن برخیا عرض کرتے ہیں کہ جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا:

اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ.[2]

میں اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)۔

اب ایک طرف وہ ہدہد علم لا رہا ہے۔ وہ علم بھی اللہ کی بارگاہ سے مل رہا ہے، دوسری طرف آصف بن برخیا بھی سیدنا سلیمان علیہ السلام کے درباریوں میں سے ایک درباری ہیں، جنہوں نے پلک جھپکنے سے پہلے تختِ بلقیس حاضر کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کتاب کا علم اللہ کے نبی کے قدموں میں بیٹھ کر مل جائے تو تختِ بلقیس بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اگر علم والے اللہ والوں کے در پر بیٹھ جائیں وہ بھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن آقا علیہ السلام کے فیوضات کا وہ دسترخوان ہے جس میں علم القرآن، علم الحدیث، علم الفقہ، استدلال و استنباط کا علم، صحبت اور ادب کے فیوضات بانٹے جا رہے ہیں۔ اس کے ذریعے آپ کے اخلاص اور وفاداری کو اس قابل کیا جاتا ہے کہ آپ ادارے کی فکر، سوچ، علم، نگرانی اور امورِ ادارت کے ساتھ وفاداری سے چلیں۔

(۱) النمل، ۲۷:۳۹

(۲) النّمل، ۲۷:۴۰

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ آصف بن برخیا نے جو وعدہ کیا اسے اللہ کے کرم سے بتمام و کمال پورا کرتے ہوئے تختِ بلقیس آپ علیہ السلام کے قدموں میں رکھ دیا ہے تو اُس وقت اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُسے اپنے ساتھ منسوب نہیں کیا بلکہ اللہ کے فضل کے ساتھ منسوب کر دیا۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے:

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ. (1)

پھر جب (سلیمان علیہ السلام نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔

یہاں اللہ کا فضل یہ ہے کہ آصف بن برخیا کو صحبتِ نبی علیہ السلام ملی ہے۔ اُن کے قدموں کی صحبت کے طفیل یہ ممکن ہوا وگرنہ اس کا ذاتی علم اس قابل نہیں تھا کہ تخت لا سکتا۔ علم والے تو بہت ہوں گے، مگر وہ علم جو درِ انبیاء اور درِ اولیاء میں بیٹھ کر حاصل کیا جائے، وہی حقیقی نتائج پیدا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ نبوت کا دروازہ ضرور بند ہوا ہے، مگر اولیاء کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ آج کے دور میں بھی اولیاء کی سنگت سے ایسے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ پیکرِ اطاعت بنا جائے۔ پیکر اطاعت بننے کے لیے انتظامی حوالے سے لوازمات چاہئیں۔ منتظم چاہیے، نظام چاہیے اور نظم و ضبط چاہیے۔ پھر اُس نظم و ضبط کو سیکھنے کے لیے قیادت چاہیے۔ ایک مثالی قائدانہ شخصیت (role model) چاہیے۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں مجددِ رواں صدی کی صحبت بھی ملی، آفاقی علم بھی ملا، مثالی درس گاہ بھی ملی، اعلیٰ آداب بھی میسر ہوئے اور سب سے بڑھ کر حضرت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی شکل میں ایک رول ماڈل بھی ملا۔ اب ضرورت اس اَمر کی ہے کہ پوری تن دہی کے ساتھ تجدید و اِحیاء دین کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دی جائیں اور اس مقصدِ سعید کے لیے تن، من اور دھن سمیت کسی بھی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا جائے۔ اگر ہم اس منزل پر

(۱) النّمل، ۲۷: ۴۰

پہنچ گئے تو مصطفوی انقلاب کا سویرا بہت جلد طلوع ہو گا اور دنیا بھر میں دینِ اسلام کی تابانیاں جگمگا رہی ہوں گی۔ اِن شاء اللہ۔

مصادر و مراجع

١۔ **القرآن الكريم**

٢۔ **آلوسی**، امام شہاب الدین سید محمود بن عبد اللہ حسینی آلوسی البغدادی (١٢١٧-١٢٧٠ھ/١٨٠٢-١٨٥٤ء)۔ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم**۔ ملتان، پاکستان: مکتبہ امدادیہ۔

٣۔ **احمد بن حنبل**، ابو عبد اللہ شیبانی (١٦٤-٢٤١ھ/٧٨٠-٨٥٥ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر، ١٣٩٨ھ/١٩٨٧ء۔

٤۔ **اسماعیل حقی**، اسماعیل حقی بن مصطفیٰ بن استانبولی حنفی خلوتی (١٠٦٣-١١٢٧ھ/ ١٦٥٢-١٧١٥ء)۔ **تفسير روح البيان**۔ کوئٹہ، پاکستان: مکتبہ اسلامیہ، ١٤٠٥ھ/١٩٨٥ء۔

٥۔ **بخاری**، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (١٩٤-٢٥٦ھ/ ٨١٠-٨٧٠ء)۔ **الصحيح**۔ بیروت، لبنان: دار ابن کثیر، الیمامہ، ١٤٠٧ھ/١٩٨٧ء۔

٦۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (٣٨٤-٤٥٨ھ/ ٩٩٤-١٠٦٦ء)۔ **دلائل النبوة**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ١٤٠٥ھ۔

٧۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (٣٨٤-٤٥٨ھ/ ٩٩٤-١٠٦٦ء)۔ **شعب الإيمان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ١٤١٠ھ/ ١٩٩٠ء۔

۸۔ **ترمذی**، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک (۲۰۹-۲۷۹ھ/ ۸۲۵-۸۹۲ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار إحیاء التراث العربی۔

۹۔ **تھانوی**، اشرف علی (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ/۱۸۶۳-۱۹۴۳ء)۔ **نشر الطیب في ذکر النبي الحبیب**۔ کراچی، پاکستان: ایچ۔ایم سعید کمپنی، ۱۹۸۹ء۔

۱۰۔ **ابن حبان**، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان التمیمی البستی (۲۷۰-۳۵۴ھ/ ۸۸۴-۹۶۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

۱۱۔ **حکیم ترمذی**، ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن بشیر (م ۳۲۰ھ)۔ **نوادر الأصول في أحادیث الرسول**۔ بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۹۹۲ء۔

۱۲۔ **حلبی**، علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ)۔ **إنسان العیون في سیرۃ الأمین المأمون. الشھیر بـ"السیرۃ الحلبیۃ"**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ۔

۱۳۔ **حلبی**، علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ)۔ **إنسان العیون في سیرۃ الأمین المأمون. الشھیر بـ"السیرۃ الحلبیۃ"**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۷ھ۔

۱۴۔ **دارمی**، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱-۲۵۵ھ/۷۹۷-۸۶۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۱۵۔ **ابو داؤد**، سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد ازدی سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ/۸۱۷-۸۸۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء

۱۶۔ **دیلمی**، ابو شجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ الدیلمی الھمذانی (۴۴۵-۵۰۹ھ/

۱۰۵۳-۱۱۱۵ء)۔ **الفردوس بمأثور الخطاب**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۱۷۔ **رازی**، فخر الدین محمد بن عمر بن حسن بن حسین بن علی تمیمی شافعی، (۵۴۴-۶۰۴ھ)۔ **مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ۔

۱۸۔ **زرقانی**، ابو عبد اللہ محمد بن عبد الباقی بن یوسف بن احمد بن علوان مصری ازہری مالکی (۱۰۵۵-۱۱۲۲ھ/۱۶۴۵-۱۷۱۰ء)۔ **شرح المواهب اللدنية بالمنح المحمدية**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء۔

۱۹۔ **ابن زنجویہ**، حمید بن مخلد بن قتیبہ الازدی (م ۲۵۱ھ)۔ **کتاب الأموال**۔ الریاض، السعودیہ: مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۲۰۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **الخصائص الکبری**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

۲۱۔ **ابو عبید القاسم بن سلام**، ابو عبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)۔ **کتاب الأموال**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۲۲۔ **عجلونی**، ابو الفداء اسماعیل بن محمد بن عبد الہادی بن عبد الغنی جراحی (۱۰۸۷-۱۱۶۲ھ/۱۶۷۶-۱۷۴۹ء)۔ **کشف الخفا ومزيل الألباس عما اشتهر من الأحاديث على ألسنة الناس**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۰۵ھ۔

۲۳۔ **عیدروسی**، عبد القادر بن شیخ بن عبد اللہ (۹۷۸-۱۰۳۷ھ)۔ **النور السافر**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۰۵ھ۔

۲۴۔ **قسطلانی**، ابو العباس احمد بن محمد بن ابی بکر بن عبد الملک بن احمد بن محمد بن محمد بن حسین بن علی (۸۵۱-۹۲۳ھ/۱۴۴۸-۱۵۱۷ء)۔ **المواهب اللدنية بالمنح المحمدية**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء۔

۲۵۔ **ابن کثیر**، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن زرع بصروی (۷۰۱-۷۷۴ھ/۱۳۰۱-۱۳۷۳ء)۔ **تفسير القرآن العظيم**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۱ھ۔

۲۶۔ **ابن ماجہ**، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۷-۲۷۵ھ/۸۲۴-۸۸۷ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر۔

۲۷۔ **ابن مبارک**، ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن واضح مروزی (۱۱۸-۱۸۱ھ/ ۷۳۶-۷۹۸ء)۔ **کتاب الزهد**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء۔

۲۸۔ **مسلم**، ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری (۲۰۶-۲۶۱ھ/ ۸۲۱-۸۷۵ء)۔ **الصحيح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۲۹۔ **مقریزی**، ابو العباس تقی الدین احمد بن علی بن عبد القادر بن محمد (۷۶۹-۸۴۵ھ/ ۱۳۶۷-۱۴۴۱ء)۔ **إمتاع الأسماع بما للنبي ﷺ من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء۔

۳۰۔ **نسائی**، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی (۲۱۵-۳۰۳ھ/۸۳۰-۹۱۵ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء+ حلب، شام: مکتب المطبوعات الاسلامیہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۳۱۔ **ابو نعیم**، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/

۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **دلائل النبوة۔** بیروت، لبنان: دار النفائس، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء۔

۳۲۔ **ابو نعیم**، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔**دلائل النبوة۔** حیدرآباد، بھارت: مجلس دائرہ معارف عثمانیہ، ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء۔

۳۳۔ **ابن ہشام**، ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب حمیری المعافری (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء)۔ **السیرة النبویة۔** بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۴۱۱ھ۔

MINHAJ BOOKS STORE

Online Shopping

Order on WhatsApp

+92 309 7417163

1

کتابوں کی خریداری کیلئے پر کلک کریں

2

کیٹلاگ سے کتابیں منتخب کریں

3

منتخب شدہ کتب کو خریداری ٹوکری میں شامل کرنے کیلئے "ایڈ ٹو کارٹ" بٹن دبائیں۔

پر کلک کر کے مزید کتب کی خریداری جاری رکھ سکتے ہیں یا اپنی خریداری ٹوکری دیکھنے کیلئے بٹن دبا سکتے ہیں۔

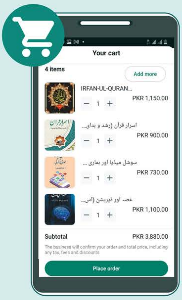

4

آپ خریداری ٹوکری میں ایک یا ایک سے زیادہ کتابیں شامل کر سکتے ہیں۔

کتابیں شامل کرنے کے بعد آرڈر کا بٹن دبائیں

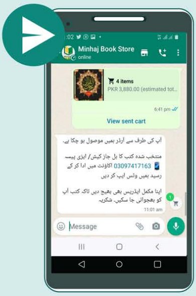

5

منتخب شدہ کتابوں کی ٹوکری میسج کریں۔

6

بل جاز کیش / ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں ادا کریں

اب آپ کی طرف سے آرڈر مکمل ہو گیا ہے۔ منہاج بک سٹور کا نمائندہ کتب آپ کے ایڈریس پر بھجوا کر آپ کو میسج کر دے گا۔